ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں



خالد حسین

برادر محترم جناب گھنشام جی

کی خدمت اقدس میں

بصد خلوص و احترام

خالص

۱۲ ۱۱

۲۸۱

Thandi Kangri

ٹھنڈی کانگڑی کا دھُواں

(افسانے)

خالد حسین

نوین پرکاشن امرتسر

میرے افسانوں کے کردار، واقعات اور مقامات قطعی فرضی ہیں۔ کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے

نام ــــ ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں

مصنّف ــــ خالد حسین

طباعت ــــ راما آرٹ پریس امرتسر

کتابت ــــ شفیقہ جان ونائی

سرورق ــــ دیپتی رنجن

تعداد ــــ ایک ہزار

سال ــــ ۱۹۸۱ء

قیمت ــــ ۳۰ روپے

پبلشر ــــ تنگھار اسنگھ شانت، نوین پرکاشن
۱۵۱، ایسٹ گوبند نگر۔ سلطان ونڈ روڈ۔ امرتسر

یہ کتاب کلچرل اکادمی کے مالی تعاون سے چھپی ہے، جس کے لئے مصنّف اکادمی کا شکر گزار ہے

انتساب

محترمی شیخ غلام رسُول صاحب

اور ـــــ

جناب غلام شاہ

کے نام ـــــ

جنہوں نے مجھے بنانے اور سنوارنے میں
نمایاں حِصّہ ادا کیا ہے۔

جناب محمود الرحمان

سندر جیت

تنویر جہاں

اور

ظفر احمد

کی

نذر

حرفِ اوّل

ادیب و فنکار بنیادی طور سماج کا ہی جز ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے، سماج اور ارد گرد کے حالات سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ اس کی نظر تیز اور گہری ہوتی ہے۔ وہ ہر بات کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ زندگی کو پوری طرح سے دیکھتا ہے، اس کے کچّے پکّے رنگوں کو پرکھتا ہے، کیوں کہ ان رنگوں میں اُس کا اپنا لہو بھی شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس کے دل و دماغ کے کینوس پر جو تصویر اُبھرتی ہے، وہ اُسے فنکارانہ چابکدستی اور ہنرمندی سے قاری کے سامنے پیش کرنے کی سعی کرتا ہے، سچّا ادیب و فنکار نئے احساس اور نئی آواز کے ساتھ ادب کے میدان میں اُترتا ہے۔ اُس کے لئے ادب پُرانا یا نیا نہیں ہوتا۔ ہاں! عوامی مسائل ضرور نئے ہوتے ہیں۔ جو وقت گزرنے اور سماجی اور سیاسی قدریں بدلنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں، سچّا ادیب اپنی تخلیق میں اُن مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کی تصویر کشی کرتا ہے چاہے وہ کڑوی ہوں یا میٹھی۔ لہٰذا ادب اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور سائنسی اثرات کا جائزہ لینے کا نام ہے۔ عوامی احساسات کی ترجمانی کرنے کا نام ہے میں نے بھی اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے وقت کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا تجزیہ کرنے اور اپنے ماحول کے اندر جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو پایا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین اور نقاد حضرات پر چھوڑتا ہوں۔

میں اصل میں پنجابی کا ادیب ہوں لیکن اُردو زبان سے گہری عقیدت رکھتا ہوں۔ ثبوت کے لئے میرا یہ افسانوی مجموعہ حاضرِ خدمت ہے۔ اُردو زبان میں لکھنے اور کتاب چھپوانے کی تحریک دینے کے لئے میں جناب علی سردار جعفری (گفتگو) جناب شمس الرحمان فاروقی (شب خون) جناب یونس دہلوی (شمع) جناب انتظار امام صدیقی (شاعر) جناب احمد سعید خان (الفاظ) جناب کماریاشی (سطور) جناب ظفر احمد، جناب نورشاہ، جناب مسعود سامون اور جناب حامدی کشمیری کے علاوہ بزم فروغ اردو جموں کے بانی ممبران جناب حکیم منظور اور ڈاکٹر منظر اعظمی کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ نیز میں اُن حضرات کا بھی ممنون ہوں، جن کے تعاون سے یہ کتاب چھپی ہے۔

خالد حسین

پیش لفظ

مختصر افسانے کی یہ تعریف کہ یہ زندگی کے کسی ایک پہلو کا انکشاف کرتا ہے، خالد حسین کے افسانوں پر بخوبی صادق آتی ہے۔ افسانے کی محدود صنف میں غالباً زندگی کے تجربات کی وسعت، پھیلاؤ اور تنوع کی سمائی ممکن نہیں، یہ کام ناول بہ طریق احسن انجام دے سکتا ہے، افسانہ نگار زندگی کے تجربات میں سے کسی تجربے کے ایک مخصوص رُخ یا پہلو کی نقاب کشائی کرتا ہے، اور قاری حیرت اور مسرت کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ افسانہ نگار زندگی کے کسی پہلو کو یک سطحی یا سپاٹ طریقے سے پیش نہیں کرتا، بلکہ اپنے مشاہدے یا فکر کی زد میں آنے والے تجربات کے مختلف اور متضاد عناصر کے امتزاج و تشدید سے ایک نئے تجربے کی لسانی تشکیل کرتا ہے، یہ تجربہ، اختصار پسندی کے باوصف فنکار کی ہمہ گیر بصیرت کا مظہر بن جاتا ہے، اور آئینہ سکندری کا کام انجام دیتا ہے اور قاری ان نادیدہ جلوؤں میں کھو جاتا ہے۔

خالد حسین کے اس مجموعے میں زیادہ تر مختصر افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ افسانے کی روایتی موضوعی پیش کش اور میکانکی ہیئتی برتاؤ سے انحراف کی ایک اچھی مثال فراہم کرتے ہیں۔ یعنی افسانہ نگار من مانے طریقے سے کسی موضوع کو کہانی کا موضوع نہیں بناتا، نہ ہی وہ فن افسانہ کے مسلّمہ اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کو اپنے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ خالد حسین اپنے موضوعات کا شعوری انتخاب ضرور کرتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات اور کھردرے پن کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے افسانہ لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔ لیکن لکھنے کے عمل میں وہ موضوعی پیش کش سے زیادہ شخصی تاثر پذیری کی دریافت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس طرح سے افسانہ اپنی تخلیقی حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ افسانے فن کے مروجہ لوازم کو سختی

سے پُروانہ کرتے ہوئے بھی اپنے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ فنکار کے داخلی وجود سے برآمد ہوتا ہے، اور اِن کے فِکر و نظر کی سچّائی کا احساس دِلاتا ہے، یہ افسانہ اپنی شکل و صورت بھی خود متعین کرتا ہے۔ چنانچہ کبھی یہ طنزیہ اسلوب اختیار کرتا ہے، کبھی تمثیلی اور اسراری بن کر رہ جاتا ہے، اور کبھی اساطیری رنگ اختیار کرتا ہے۔ کبھی یہ حقیقت اور خواب کے آپس میں گڈمڈ ہونے کے عمل کو واضح کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو خالد حسین اردو افسانہ نگاروں کی جدید نسل سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جلد ہی اُن کی منفرد آواز پہچانی جائے گی۔ اور کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں میں وہ ایک طاقتور افسانہ نگار کے طور پر تسلیم کئے جائیں گے۔

حامدی کاشمیری
پروفیسر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی
حضرت بل، سرینگر


ترتیب

اشتہاروں والی حویلی

اس حویلی کا نام اکرام منزل تھا۔ اس محلہ کی تین چار بڑی حویلیوں میں سے ایک حویلی.... اکرام منزل مستری اکرام کھوکھر کی حویلی — محنت، مزدوری، عقل، سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کے چونے گارے سے بنی ہوئی یہ حویلی .... آج بھی مستری اکرام کھوکھر کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے مستری اکرام کھوکھر کو،... اپنے زمانے کی ایک مشہور ہستی تھے — لمبا قد، چھریرا بدن، گورا چہرہ.... موبل آئل اور گریس سے بھری سیاہ ڈانگری میں بھی سورج کی طرح چمکتا رہتا۔ چوڑے ہاتھوں میں بیمار گیئر بکس، گراریاں، نٹ بولٹ، پمپ، سلنڈر.... صحت یاب ہو کر کھیلنے لگتے، روتا انجن ہنسنے لگتا۔ شب و روز کی محنت نے گاڑیوں کے مستری اکرم کھوکھر کو دلاور بس سروس کا حصہ دار بنا دیا تھا — بڑے شریف، ملنسار، سماجی قدروں کے پیارے، غیرت اور عزت کے رکھوالے ہر ایک کے ہاں جاتے، دنیا داری کو سمجھنے والے۔ اچھی اور بری آنکھ کو پہچاننے والے — تین لڑکیاں ہوئیں، پر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اکرام کھوکھر نے ان کی شادی کر دی

تاکہ اُن کی عزت کی چادر کہیں داغدار نہ ہو جائے ـــ اکرام منزل میں دو لڑکے بھی نازل ہوئے اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر۔ پڑھنے لکھنے کی تمام سہولتیں، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ ہر طرح کی ناز برداریاں۔ پر دونوں تیرھویں کے چاند نکلے۔ کھوکھر خاندان اور اکرام منزل پر میلی چاندنی چھٹکنے والے۔

ـــ اسلام کھوکھر۔ کباڑیا، تیور، پکا شرابی۔ حلیمہ کا خاوند۔ تین بچوں کا باپ اور تنخواہ چار سو ہر رات کی کالک شراب کی بوتل میں گھل جاتی۔ بوتل ..... اسلام کھوکھر کے حلق سے اترتے ہی پیٹ میں چلی جاتی اور ناچنے لگتی۔ ناچتا جسم گانے لگتا۔ گاتا شریر اڑنے لگتا۔ پھر اڑان اسلام کھوکھر کو آسمان پر لے جاتی۔ آسمان گونجنے لگتا۔ ..... اور جانے کب گونجتے آسمان سے اسلام کھوکھر ..... اکرام منزل میں گر پڑتا اور بے ہوش ہو جاتا۔ شراب کی اس بوتل میں دھیرے دھیرے ..... حلیمہ بھی گھلتی گئی۔ گھر کا خرچ۔ بچوں کا پالنا ..... اور حلیمہ کا جیون، سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ لگنے لگا۔ اسلام کھوکھر اس کے لئے جیتے جی مر گیا ـــ آخر ایک دن حلیمہ بچاری نے مرے ہوئے آدم کا پیرہن اتار کر دور پھینک دیا، اور اپنی بھوک کا اور یا بستر اٹھا کے ہمیشہ کے لئے قاسم کے گھر چلی گئی ـــ اکرام منزل کی سفید دیوار پر یہ پہلا اشتہار لگا تھا ـــ

اکرام منزل کا دوسرا چاند، انعام کھوکھر ..... جلد ہی اس بڑے شہر کا بڑا چاند بن گیا ـــ "حرام زادو! میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ ادیئے! تمہاری ماں کی ..... تمہاری بہن کی ....." ـــ ہاں! یہ گالیاں ہی ہیں۔ خدا کی بخشی ہوئی زبان سے نکلنے والی گالیاں۔ انعام کھوکھر کی گالیاں۔ بڑی بھیانک گالیاں۔ انسانی ضمیر کو قتل کرنے والی گالیاں۔ یہ گالیاں، ہر رات اکرام منزل کی دیواروں کو چیر کر میرا پیچھا کرتی ہیں۔ میرے کان پھٹنے لگتے ہیں یہ گالیاں سن کر ـــ یہ گالیاں، ساری ساری رات مجھے سونے نہیں دیتیں۔ مجھے بہت بے چین کر دیتی ہیں، کیونکہ اکرام منزل کی دیواریں میرے کچے کوٹھے کے ساتھ لگتی ہیں ..... اور میں اپنی کوٹھری کے اندر بیٹھا سب کچھ سنتا رہتا ہوں۔ بہت کچھ دیکھتا رہتا ہوں ـــ میں نے اکرام منزل کی بہاریں دیکھی ہیں،

اس میں دولت، عزت، شرافت، لیاقت اور غیرت کا رول دیکھا ہے اور میں پچھلے بیس سال سے اکرام منزل میں شراب، بے حیائی اور گالی گلوچ کا راج دیکھ رہا ہوں ـــ

انعام کھوکھر ـــ کچا شرابی، نکما مستری، ٹرانسپورٹ ورکشاپ میں تیل گر بسیا۔ اوپر سے ورکشاپ کے کام کا خدا ہی حافظ ہے۔ حاضری کلرک کو ماہوار دس روپے دے دیجئے، پھر چاہے پورا مہینہ ورکشاپ سے غائب رہئے۔ ملازموں کی حاضری لگتی رہتی ہے۔ انعام کھوکھر نے بھی حاضری کلرک کے ساتھ مہینا لگا رکھا تھا۔ وہ کئی کئی دن ورکشاپ سے غائب رہتا۔ کوئی کمائی کرنے کے لئے نہیں، صرف شراب کے ٹھیکے کا طواف کرنے کے لئے، ٹھرے کی بوتل پینے کے لئے، نالیوں میں گرنے کے لئے اور ہر رات گالی گلوچ بکنے کے لئے۔ اچھی زندگی کے لئے جدوجہد کرنا وہ بے کار سمجھتا تھا پہلے وہ شراب کو پیتا تھا، پھر آہستہ آہستہ شراب اسے پینے لگی ـــ گھر کا خیال، نہ بچوں کی فکر، بیوی کا غم، نہ اپنوں کا لحاظ، نہ بیگانوں کا ڈر۔ محلے داروں، رشتے داروں اور ہمسایوں سے بے غم انعام کھوکھر .... اکرام منزل میں چنگھاڑتا رہتا۔ ہر رات بھیانک گالیوں کے روپ میں۔ انسانی ضمیر کو قتل کرنے والی گالیاں ـــ اور اکرام منزل کی دوسری بہو.... زہرا، انعام کھوکھر کے گھر کی مرغی.... اپنے چوزوں کو ناقوں سے بچانے کے لئے، انہیں دانہ کھلانے کے لئے...... کبھی کبھی پرائے گھروں میں بھی جانے لگی، لیکن اس نے اپنے آدم کا پیرہن گلے سے نہیں اتارا۔ اس نے اس پیرہن کو ہی اپنی تقدیر مان لیا ـــ اپنے آدم کے لباس میں چھپ کر رنگ برنگے کپڑے پہننے والی زہرا کی باتیں ہونے لگیں۔ باتیں، منہ سے نکل نکل کر محلے میں پھیلنے لگیں۔ باتوں کا ایک اشتہار بن گیا اور اشتہار اکرام منزل کی دیوار پہ چسپاں ہو گیا۔ اکرام منزل کی میلی دیوار پہ لگا ہوا یہ دوسرا اشتہار تھا، مگر اس اشتہار کی عبارت سے بے خبر انعام کھوکھر.... اپنے رنگ میں مست تھا۔ اس اشتہار کی کالی سیاہی سے بے فکر زہرا.... گھر کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگی ہوئی تھی ـــ وقت بڑا تیز دوڑ رہا تھا۔ پر انعام کھوکھر کے لئے تو وقت اس دن سے رُکا ہوا تھا جس دن سے اس کی زبان نے شراب کا ذائقہ چکھا تھا ـــ پھر شراب کے ذائقہ نے باقی سب کچھ ہضم کر لیا، لیکن

وقت کسی سے بھی ہضم نہیں ہو سکا۔ وقت سرپٹ دوڑتا رہا اور دوڑتے وقت کے ساتھ کم سن چوزے ... سیانے ہو گئے۔ بالغ ہونے والے چوزوں میں سے سب سے بڑے کا نام تھا حسنا کھوکھر انعام کھوکھر کی پلوٹھی لڑکی ——

حسنا کھوکھر ... شام کا جھومر، صبح کی جھانجھر، دلکش سنہری بہار کا گلدستہ، کھلا موتیا، ہنستا گلاب، حسنا کھوکھر ... خوبصورت اپسرا۔ حسنا کھوکھر ... بلبل کی طرح بولتی، کوئل کی طرح کوکتی۔ شادی بیاہ کی محفلیں اسے گلے لگاتیں، گانے، گیت، غزلیں سب کو مست بناتیں۔ روپ کے موتی چگنے والے پنچھی اس کی نیلی آنکھوں میں چوگ چگنے کی سبیل ڈھونڈتے —— حسنا کھوکھر ... ایک بل کھاتی ناگن۔ آوارہ سپیرے اسے اپنی اپنی پٹاری میں بند کرنے کی فکر کرنے لگے —— اکرام منزل کے ارد گرد آوارہ دھند پھیلنے لگی —— والدین کی خشی ہوئی باتیں بچوں کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔ حسنا کھوکھر بھی اپنے ماں باپ کے زنگ آلود شیشے کی پرچھائیں تھی۔ ان کے کارناموں کا کھٹا میٹھا سنگم۔ وہ بھی اپنے لئے تباہی کا سامان پیدا کرنے لگی —— جوبن اس کے بدن پر پھوڑے پھنسیوں کی طرح پھوٹ پڑا تھا ...... اور پھر پھوڑے پھوٹ کے عاشقوں کی جھولی میں پیپ بننے لگے۔ وہ کھلے عام اپنے بدن پر جونکیں لگوانے لگی۔ جونکیں، جو اس کا گندہ لہو چوس لیتیں۔ آوارہ سپیرے اس پر منتر پھونکتے رہتے —— حسنا کھوکھر ... شہرت کی حدیں پھلانگنے لگی۔ اکرام منزل میں کئی گلناریں، سہیلیوں کے روپ میں آنے جانے لگیں —— شرد غار مٹیاریں۔ ساڑھیوں کی سرسراہٹ، شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور جھانجھروں کی چھنچھناہٹ۔ روغنی مکھڑوں کو ڈستی زلفیں، تھرتھراتی چھاتیاں، مٹکتے کولہے، پھڑکتی رگیں، ناچتی آنکھیں۔ کانوں میں کھسر پھسر، آپسی رازداریاں اور پھبتی کے دل کش پھوارے۔ حسنا کھوکھر ... روزی کمانے کا ٹھیکرا بن گئی۔ اس کی نظر روز بروز بالغ ہوتی گئی۔ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جانے لگی۔ وہ ایک ایک وقت کے کھانے کا بل سو سو روپے دینے لگی ... سگریٹ، شراب اور کباب کے بغیر اسے ناشتہ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سوچ کی اڑان

اب بہت اونچی تھی وہ اب دو جسموں کے ملاپ کو لذت حاصل کرنے کا ایک فطری تقاضا سمجھتی تھی۔ اس کے لئے اب سماجی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ اب اکثر کہتی کہ اگر دو جوان جسم باہمی رضامندی سے اپنے مشترکہ جذبے کی تکمیل کے لیے ملیں تو یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر سماج والے شور مچائیں اور شرع یا قانون کا آسرا ڈھونڈیں ـــ حسنا کھوکھر...اس شہر کا روشن ستارہ۔ اکرام منزل کی کالی دیوار پر لگا تیسرا لگو سب سے بڑا اشتہار تھا جس کی عبارت پڑھنے کے لئے بانکی نظریں بے تاب رہتیں۔

اکرام منزل کے ایک کونہ میں ایک گونگا کردار بھی رہتا تھا... جو اپنے خیالوں کے شیشے میں کبھی اکرام منزل کی بہاریں دیکھتا رہتا اور کبھی آنکھوں کے سامنے ناچتے پت جھڑ کو۔ اس گونگے کردار کا نام بے بے حاجراں تھا ـــ مستری اکرام کھوکھر کی بیوہ۔ اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر کی ماں۔ بیتی زندگی کے پُر بہار دنوں کی یاد آتے ہی اس کے چہرے پر چراغ روشن ہو جاتے ـــ لیکن حویلی کی بگڑی حالت دیکھ کر گونگا کردار خاموش رہتا۔ اس کی آنکھوں سے گنگا بہتی۔ اکرام کھوکھر کی موت کے بعد بے بے حاجراں کے چہرے پر کئی دراڑیں پڑیں۔ پھر رفتہ رفتہ دراڑیں اس کا نصیب بن گئیں۔ اس کی ساری حسرتیں، امیدیں اور خواہشیں مٹی میں مل گئیں ـــ اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر...... بے بے حاجراں کے گلے کے گلھڑ.... آسے بہت تکلیف دیتے۔ وہ دکھوں کی بھٹی میں جل جل کر کوئلہ بن چکی تھی۔ جانے اس نے کتنے سال، مہینے اور دن ہضم کر لئے تھے، پر پھر بھی کوئلہ راکھ نہیں بن رہا تھا۔ بے بے حاجراں بہت دعائیں مانگتی، مگر آسمان اس پر مہربان نہیں ہو رہا تھا ـــ

اکرام منزل کی دیواروں پر لگے اشتہاروں کو دیکھ کر بے بے حاجراں بہت دکھی تھی۔ وہ دن کے اجالے میں لگنے والے اشتہاروں کو رات کے اندھیرے میں پھاڑنے کی کوشش کرتی ـــ وہ اکرام منزل کی کالی دیواروں کو دھوتی۔ اشتہاروں کی عبارت کو مٹاتی، پر کالی دیواروں کو وہ جتنا صاف کرتی.... اشتہاروں کے لفظ اتنے ہی گہرے ہوتے جاتے۔ وہ بے چین ہو جاتی ـــ

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ حسنا کھوکھر کے جسم کو دس بارہ جونکیں اکٹھی چمٹ گئیں۔ اس کے شریر کا سارا گندہ لہو چوسنے کے لئے۔ مگر ان جونکوں نے اپنی کھوکھری سے حسنا کھوکھر کا سارا

جسم زخمی کر دیا۔ وہ بچاری لہولہان ہو گئی اور آخرا٘س کے کچھ خیر خواہوں نے اُسے بے ہوشی کی حالت میں اکرام منزل میں لایا۔ حسنا کھو کھر کو بے ہوش دیکھ کر اکرام منزل میں ایک زلزلہ آیا۔ کالی چِٹی دیواریں کانپنیں۔ اشتہاری دیواریں لرز اٹھیں۔۔۔ اور پھر ساری خستہ حویلی دھڑام سے ڈھہ گئی۔ حویلی گرنے کی ایک بھیانک آواز آئی۔ لوگ دوڑے، اکرام منزل کی گرتی دیواریں دیکھنے کے لئے۔ حویلی کو مٹی میں ملتے سب نے دیکھا۔ تماشہ دیکھنے والے لوگ ٹوٹی دیواروں پر لگے کئی اور چھوٹے موٹے اشتہار بھی پڑھنے لگے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ گری ہوئی حویلی کے ملبہ کی گرد سے اکرام منزل کے باسی اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے باہر آئے ۔۔۔۔ اور اپنے سر مسجدوں کے میناروں سے بھی اونچے کر کے چلنے لگے۔ صرف اکرام منزل کا گونگا کیمدار غائب تھا۔ اُسے کسی نے ڈھونڈا بھی نہیں۔ شاید وہ حویلی کے ملبہ کے نیچے دب گیا تھا ۔۔۔۔۔ اور مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا تھا۔

بیڈے کی لنکا

بیڈے کی لنکا کھڑی ہے ـــــ بڑے بڑے حادثوں، بھونچالوں اور طوفانوں کے باوجود بھی یہ کوئی راون کی لنکا نہیں، جسے کوئی اجودھیا کا رام آ کے ڈھا جائے۔ یہ تو بیڈے کی لنکا ہے، مدود کچے کمرے، ایک پکی بیٹھک اور تھوڑا سا آنگن.... اس لنکا کی کل دولت ہے بیڈے کی لنکا میں آب و ہوا سخت گرم اور سخت سرد ہی رہتی ہے، یہ معتدل کبھی نہیں رہی۔ یہ لنکا اس عظیم بستی میں کھڑی ہے، جسے کبھی محلہ اُستاد غوث محمد خان کہتے تھے۔ پر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس محلہ کی ساری شان و شوکت، غیرت اور عزت کو مٹا کر رکھ دیا اور اس محلہ کا نام سکڑ کر صرف اُستاد محلہ رہ گیا۔

اِس لنکا کے جنوب مغرب کی جانب گاشاں اور جاناں دھوبنوں کا کچا کوٹھا ہے، جن کا نام اب اللہ کے فضل سے دور دور تک مشہور ہو چکا ہے۔ بیگاں اور رمضو دھوبی کے کائی لگے کھنڈروں کے لئے گاشاں اور جاناں کے تھرکتے سر پرستونوں کا کام دے رہے ہیں۔ شمال جنوب کی طرف بلّو

چمارن کی خود مختار مملکت ہے جو کچھ اصولوں پر سختی سے کاربند ہے۔ ان اصولوں کے کارن پلّو چمارن اپنا کاروبار کبھی بھی اپنے اڑوس پڑوس نہیں چلاتی۔ چاہے کتنی ہی قحط سالی کیوں نہ ہو، اس نے اپنا کاروبار ہمیشہ استاد محلے کی سرحد سے باہر ہی چلایا۔ گاشاں اور جاناں کی طرح نہیں کہ محلے کے پرانے نمازیوں اور نئے مجاہدوں کو ایک ہی صف میں بٹھا کر گلابی جشن کراتی پھریں۔ پورب پچھم کی جانب کالو سبزی والی کا کوٹھا ہے۔ کالو کی ڈھلتی جوانی کی طرح اس کے کوٹھے کو بھی دیمک لگی ہوئی ہے پر اب تو کالو کی موزنی بھی مستی میں ناچنے لگی ہے۔ اور ماں کی تربیت کی بدولت آج کل وہ خود اکیلی اترائی پھرتی ہے۔ اسی لئے اب انہیں کسی نوچیلد کی ضرورت نہیں رہی۔ تبھی تو کچھ دیر پہلے ماں بیٹی نے اس بچارے کو مار مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ بیڈے کی لنکا کے آس پاس اس طرح کے چھوٹے چھوٹے اور بھی ہمسائے مانے جاتے ہیں پر ان کی شہرت اتنی نہیں کہ پبلسٹی کے اس دور میں ان کی بات کی جائے۔

بیڈے کی لنکا کی شہرت کستوری کی طرح ان دنوں پھیلنی شروع ہوئی جب ملک تقسیم ہوا۔ سارے علاقے میں ایک آندھی چلی۔ بھارت کی پوتر دھرتی اور پاکستان کی پاک سرزمین سے لوگ بھاگنے لگے۔ استاد محلہ بھی خالی ہونے لگا اور خالی مکانوں میں نہ جانے کہاں کہاں کی اینٹیں اور پتھر جمع ہوتے گئے۔ بیڈے کے سبھی رشتہ دار موت سے ڈرتے اور زندگی کے لئے پناہ ڈھونڈتے ان قافلوں میں شامل ہو گئے جو ایک نئے سفر کو چل پڑے تھے۔ نئی زندگی کی تلاش میں۔ بیڈے کے ماں باپ، بہن بھائیوں نے اسے ساتھ چلنے کے لئے بہت زور لگایا۔ اس کی منتیں کیں، پر بیڈے نے اپنی لنکا چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا دل بھی کسی سیتا پر آیا ہوا تھا۔ وہ اپنی لنکا میں سیتا کو رانی بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ڈرتا تھا سماج کی کچی پکی دیواروں سے کہ کہیں وہ اس کے کارن گر نہ پڑیں۔ کہیں لال خون، سفید خون، سبز ہو، کیسری ہو..... اس کی وجہ سے بہہ نہ جائے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور وہ سیتا کے گھر سے لے کر اپنی لنکا کے خوشگوار گزر راستہ کو ہموار بنا لے گا ــــ پھر اس کا

یقین حقیقت بن گیا۔ حالات ٹھیک ہو گئے۔ بے رونق زندگی میں پھر رونق آگئی، مگر بیڈے کی لنکا میں سیتا نہیں آئی۔ وہ تو اپنے کنت کی باہنوں میں سما گئی۔ اُس کا سارا حسن راجہ کی جوانی میں جذب ہو گیا۔ وہ پکے آم کی طرح راجہ کی جھولی میں گر پڑی۔ پکا آم .... شہد کی طرح میٹھا۔ راجہ سب کچھ بھول گیا، ایک بیوی اور دو بچوں کو بھی۔ اسے تو تازہ آم چوسنے کو مل گیا تھا۔ وہ سیتا کو بھگا کر لے گیا۔ نئی دھرتی، نئے لوگوں میں۔ بیڈے کی لنکا پر بجلی گر پڑی۔ دیواریں لرزیں، زمین پھٹنے لگی پر لنکا نہیں گری۔ بیڈا فرعونِ مصر کی طرح غرق نہیں ہوا۔ وہ تو بہت سخت جان نکلا۔ وہ سب کچھ پی گیا بھنگ اور شراب میں گھول کر۔ اِس نے ایک نئی زندگی ڈھونڈ لی۔۔۔

لنکا میں ایک نئی رونق آگئی۔ کچھ پرانے دوست کچھ نئے یار۔ نہ کوئی سجن پوچھن ہار۔ راون کی لنکا میں سونا ہی سونا تھا پر بیڈے کی لنکا میں چرس، گانجا، چنڈو، افیم، بھنگ، شراب .... ہر چیز شباب پر تھی۔ بیدو، چھیدو، چھپالی، ٹھنڈو، اکا، تورا، بشیرا .... بیڈے کی لنکا کے چاند تارے، دن رات ..... حال مست، چال مست۔ کڑدیج، مانگ پتا، چیلا، ٹلاش، بیلو، دانہ، کسی کی چوکڑیاں جمتی رہتیں۔ بھنگ اور شراب کے گلاس خالی ہوتے رہتے۔ گانجا، چرس، چنڈو کے کش، افیم کی گولیاں ..... لنکا کو مست بنائے رکھتیں۔۔۔

"گامی یار! تاجی کی کڑی تو آگ ہے آگ۔"

"ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تند ہوا کے تیز جھونکے اس آگ کو ٹھنڈا کر دیں گے۔"

"چودھری کی بہو آج کل شادے کے ساتھ پھنسی ہے۔"

"اُس کبوتری کا کیا ہے۔ تو دانہ ڈال دے، کبوتری کابک میں آجائے گی۔"

"چھپالی! تم نے پوائنٹ ڈالا؟"

"قسم ربّ کی، سب سے پہلے۔"

"ایک پوائنٹ کم ہے بھئی جس نے نہیں ڈالا، وہ ڈال دے۔ ورنہ میں ایک موٹی سی گالی دوں گا۔"

"کون مائی کا لعل ہے جو ہمیں گالی دے۔ چیر کر نہ رکھ دوں۔"

بھائی ملفوے! پاکستان کہتا ہے کہ ہم افغانستان کی پسلیاں توڑ دیں گے، اور اگر کسی نے بیچ میں ٹانگ دینے کی کوشش کی تو ہم اس کی بھی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ بھائی صاحب! اب پاکستان پہلے ایسا نہیں رہا۔ اب کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔"

"او ہٹیے رہنے دے یار، رہنے دے۔ کہیں سر منڈواتے ہی اولے نہ پڑیں۔"

"سنا ہے یار! امریکہ نے چاند کی دھرتی پر قدم جما لئے ہیں۔"

"بالکل بکواس۔ بھلا خدا کی طاقت کے ساتھ کون لڑ سکتا ہے۔"

"لعنت بھیجو یار، ان فضول باتوں پر۔ ان میں کیا رکھا ہے تم لوگ بھنگ گھوٹو۔"

بیڈے کی لنکا کے چاند تارے، باہر کی دنیا کی سبھی فضول باتوں کا گلقند بنا کر کھا جاتے اور بھنگ پیتے رہتے۔ ان چاند تاروں کا ہسٹری شیٹ بنا ہوا تھا۔ اور گلی ڈنڈا کھیلنے والی عمر سے ہی یہ کبھی پولیس کو آگے آگے اور کبھی پیچھے پیچھے چلاتے پھرتے۔ بیڈے کی لنکا میں چنڈو، گانجے اور چرس کے بادلوں میں کبھی کبھی گاشاں، جاناں، کاکو، دلیشو کے ننگے سائے بھی لہراتے ہوئے دکھائی پڑتے۔ آوازیں ابھرتی رہتیں، پتے چلتے رہتے، دلانے گرتے رہتے، مال نکلتی رہتی۔ اور سیدھا گولک میں جمع ہو جاتی۔ اور جب گولک اپنا مونہہ کھولتی تو تھانیدار سے لے کر ایس، پی صاحب اور سیشن جج صاحب تک خیرات پاتے۔ خیرات بالکل اسلامی ڈھنگ سے دی جاتی۔ کیونکہ مولوی جی نے فرمایا تھا۔ "خیرات ایک ہاتھ سے ایسے دو کہ تمہارے دوسرے ہاتھ کو بتہ تک نہ چلنے دے۔" اور جب کبھی اس نظام میں بے ضابطگی ہو جاتی تو لنکا میں ایک زلزلہ آجاتا۔ چہل پہل ختم ہو جاتی کھیل خراب ہو جاتے۔ بھنگ، شراب، چرس، گانجا، افیم...... بیڈا، ظفرا، نذرا، بشیرا، گاما...... شرابی، کبابی، افیمی، چرسی...... پولیس، چھاپہ، مکے، شور شرابہ، جامہ تلاشی، گولک، ہتھکڑیاں، تھانہ، عدالت، جیل اور بھونچال ختم۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد بیڈے کی حالت کئی کئی روز تک بہت پتلی رہتی۔ اسے

کئی کئی دن فاقے لگتے۔ محلے کے کئی چودھری ہمدردی جتاتے اور لنگا کو ٹھولہ کے بھاؤ خریدنے کے لئے بیڈے کو جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ پرواہ پرائی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ وہ سب کو ایک ہی جواب دیتا۔

"بیڈے کی لنگا بک نہیں سکتی۔ پہلے کی لنگا کھڑی ہے اور کھڑی رہے گی۔ چاہے بھوک ننگ بیڈے کو کھا جائے۔"

پر بھوک اسے کھا نہ سکی۔ وہ بھوک کو کھا جاتا۔ ایک لمبے عرصہ تک ایسے ہی چلتا رہا۔ لیکن آخر کہاں تک جمہوری دور کی جمہوری حکومتیں نئے نئے سپنے دکھاتی رہیں جنکی پھیکی تعبیر غریب کے سوالوں کی طرح پھیلتی ہی جاتیں۔ اور بیدے، چھیدے، نتھے، طفرے تقسیم کے سوالوں کی طرح سکڑتے ہی جاتے۔ بیڈا بھی دن بدن سکڑتا گیا۔ جوانی بڑھاپے کے آگے ہتھیار ڈال رہی تھی۔ اسکی زندگی کی گاڑی کے گھوڑے اب ڈھیلے پڑنے لگے تھے... جبکہ پولیس کی مشین کے پرزے سخت ہونے لگے تھے۔ اب پولیس کی نظروں میں کوئی لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ کھا پی کر بھی وقتاً فوقتاً یلغار کر دیتی۔ تقسیم کی طرح سکڑتے سمٹتے لوگ اپنے شغل پورے کرنے کیلئے کوئی نئی کچہار ڈھونڈنے لگے۔ لنگا میں آوازوں کا بے سُرا سنگیت ختم ہو گیا۔ چنڈو بگانے۔ چرس کے بادل چھٹنے لگے۔ گانشاں، جاناں، کاکو، ویشو کے سائے مٹتے گئے اور بیڈا اپنے؛ جودکی کیاں کوٹھری میں گم ہوتا گیا۔ وہ کبھی کبھی باہر کی دنیا کا بھی چکر لگاتا اور بڑا دکھی ہو جاتا۔ وہ دیکھتا۔ محلے کے لگ بھگ آدھے مکانوں پر سرکار نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ دیکھتا۔ برساتی کیڑوں کی طرح کئی سچے جھوٹے... بھائی، بیٹے، ماں، چاچے، بیٹیاں، بہنیں، موسیاں، مر گئیوں کے مکانوں کے وارث پیدا ہو گئے تھے جو سونے کو مٹی کے بھاؤ بیچتے تھے۔ وہ بے چین ہو جاتا۔ لیکن کچھ نہ کہتا۔ اس کا بھی کئی مکانوں سے ساتھ دودھ اور لہو کا رشتہ تھا۔ مگر اس نے اپنی لنگا کے سوا کسی چیز کی جانب کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بیڈے کی ابتری حالت دیکھ کر بہنو مائوں کی

فوج نے لنکا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لوڑا، بشیرا، امیدو، چھیدو آہستہ آہستہ گھر گھرہستی کے بلانے ملکیلنے لگ پڑے تھے۔ پر بیڈے نے ایسا کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ اس کی لنکا اس کی دنیا تھی اور وہ اپنی دنیا کا بے تاج بادشاہ ... جو اب کئی کئی روز لنکا سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔ سینے میں کئی درد دفن کئے ہوئے آنکھوں میں ختم نہ ہونے والی آس کا ایک دیا جلائے ... وہ کمرے میں ٹوٹی پھوٹی کھٹیا پر پڑا رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے دیکھتا رہتا۔ اس کی حالت دیکھ کر محلے کے چھ بدمعاشوں نے لنکا میں آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ بیڈے کی خیریت پوچھتے۔ اسے دوا دارو کے لئے پیسے دینے لگتے۔ اس کے لئے دوائی لاتے۔ وہ تماشہ دیکھتا رہتا ... اور پھر سب کو ایک ہی جواب دیتا۔

"بیڈے نے خوب بدمعاشی کی ہے۔ جی بھر کے جوا کھیلا ہے۔ بیڈے کو تاش کے باون پتوں کی اچھی طرح سے شناخت ہے آج کل بیڈا زندگی کا جوا کھیل رہا ہے اور جیت ضرور بیڈے کی ہوگی۔"

—— شام کو کبھی کبھار بیڈا اپنی لنکا کی چھت پر بیٹھ کر دور سامنے سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہتا اور سوچتا۔ ... کاش سورج پھر اسی طرف سے چڑھے اور دوڑتا دوڑتا اس کی گود میں آکر بیٹھ جائے۔ لیکن سورج مغرب سے کبھی نہیں چڑھتا۔ وہ تو ہمیشہ مشرق سے نکلتا ہے —— اور جب کبھی مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے اُلجھنے لگتے تو بیڈا مایوس ہو جاتا۔ اس کا چہرہ بے رنگ ہو جاتا اور آنکھیں بے نور۔ موت کی سی خاموشی اسے گھیر لیتی۔ وہ جو کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ روز مسجد میں جاتا۔ نماز اسے آتی نہ تھی پر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا اور نمازیوں کو سجدے کرتے دیکھ کر دل ہی دل میں جانے کتنے سجدے کر ڈالتا۔ پھر وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیتا۔ آسمان جو آگ برسا رہا ہوتا۔ آسمان جس نے قیامت مچائی ہوتی۔ اور جب کبھی پورب اور پچھم آپس میں مل بیٹھنے کا فیصلہ کرتے تو بیڈے کے بے رونق چہرے پر خوشیوں کے کئی رنگ چڑھنے لگتے۔ آنکھوں میں ختم نہ ہونے والی

اس کا نور پھر چمکنے لگتا اور موت کی سی خاموشی زندگی کے مدھر سنگ [illegible]

ایک دن باغ کے پاس کاکے کی ریڑھی کے سامنے میں بیٹھا ہوا گوشت کھا رہا تھا بیدا شراب کے نشے میں دھت میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے سلام کیا اس نے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے گھورتا رہا اور پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"بیٹا! تم بیڈے کو نہیں جانتے۔ تم ندی نالی بیڈے کو جانتی تھی۔ وہ بیڈے کو بہت چاہتی تھی۔ کیوں نہ چاہتی، بیدا اس کا بیٹا تھا۔ تم لوگ پڑھ لکھ کر بابو بن گئے ہو مگر بیدا ..... بابو نہیں بنا۔ وہ شرابی کبابی، جواری، بدمعاش بن گیا۔ بیڈے کا یہاں کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتا تو وہ بھی بابو بنتا۔ بیڈے کا یہاں کوئی بازو نہیں جبھی تو سبھی اسے کچلنا چاہتے ہیں۔"

"بھائی صاحب! بات کیا ہوئی۔ آپ اتنے دکھی کیوں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا! بیدا دکھی نہیں ہوتا۔ وہ تو دکھوں کو پی جانے کا عادی ہے لیکن محلے کے ان موٹوں کی کرتوت، نہ پوچھو، جنگ میں لوگوں کا نقصان ہوا، سرکار کی طرف سے انہیں پیسے ملے جن کا نقصان نہیں ہوا تھا۔ ان عزت دار چوہدریوں نے مٹھی گرم کر کے انہیں بھی رقم دلا دی۔ بیڈے کی بھی آدھی لنکا ڈھ گئی تھی۔ مگر اس کا کسی نے نام تک نہ لیا۔ کوئی بات نہیں۔ بیدا ابھی زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں۔ اسے کبھی سہارے کی ضرورت نہیں۔ بیدا خود اپنی گری ہوئی لنکا پھر کھڑی کرے گا۔"

"مگر بھائی صاحب! آپ اپنا مکان فروخت کیوں نہیں کر دیتے۔"

"ہرگز نہیں۔ بیڈے کی لنکا بک نہیں سکتی۔ یہ لنکا امانت ہے۔ بیدا امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ بیڈے کے بھائی بہن، ان کے بیٹے بیٹیاں، اس لنکا کے وارث۔ جب واپس آئیں گے تو کیا کہیں گے یہی نا کہ بیدا کتنا کمینہ نکلا پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لنکا بیچ دی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بیدا لنکا کا رکھوالا ہے۔ بیدا لنکا بیچ نہیں سکتا۔"

"بھائی صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ تو اب یہاں کبھی نہیں آ سکتے۔ وہ تو ......"

"بکواس بند کرو۔"—— وہ چلایا۔ اُس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا اُس کے شریر کا سارا لہو اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا —— اور پھر آنکھوں میں اترا ہوا لہو..... دھیرے دھیرے اپنی رنگت بدلنے لگا —— اُس نے مجھے چھوڑ دیا..... اور چپ چاپ اپنی لنکا کی طرف چل پڑا... لیکن میری قمیض تار تار ہو چکی تھی ——

شردھالو

کتنی گندگی ہے .... دکانوں کے آگے، کوڑا کرکٹ کا ڈھیر .... پر لوگوں کی بھیڑ، سبزی منڈی میں .... سبزی خرید رہی ہے ـــ آلو، مٹر، گوبھی، ٹماٹر، شلغم، پیاز، پالک ..... آوازیں ہی آوازیں ـــ شور ہی شور .... اور ایک گائے ..... مولیوں کی چھابڑی سے .... ایک مولی .... مونہہ میں ڈال کے آگے بڑھ گئی۔ سبزی والا کرشنا .... اپنے گاہکوں کو چھوڑ کر ..... لاٹھی لئے .... گائے کے پیچھے دوڑا ـــ "میریں تمہارے پالنے والے۔ حرام زادی" .... اور پورے زور سے لاٹھی برسنے لگی۔ گائے .... سڑک پر توڑنے والے مزدور کی طرح .... سوکھی سڑھی .... ہڈیوں کا پنجر ـــ روح .... جو ادھ مرے شریر میں جانے کہاں اٹکی ہوئی تھی، لاٹھی پڑتے ہی پنجر سے آزاد ہو گئی۔ اور گائے کا پوتر شریر .... ایک مولی کے لئے .... سبزی منڈی میں ـــ آوازیں ہی آوازیں .... شور ہی شور ـــ لوگ سبزی خرید رہے ہیں ـــ

پھر ایک دن .... گئو ہتیا بند کروانے کے لئے .... گئو رکھشکوں کا آندولن ـــ سینکڑوں بے گناہوں کا لہو .... سڑکوں میں، گلیوں میں، دکانوں میں .... آوازیں ہی آوازیں .... شور ہی شور .... جلوس ہی جلوس .... نعرے ہی نعرے ـــ "گئو ہتیا بند کرو۔ گائے ہماری ماتا ہے اس کی رکھشا ہم کریں گے" .... اور نعرے لگا رہا تھا .... سبزی منڈی کا کرشنا۔

کھوکھلا سورج

میں کہانی ٹکڑوں میں لکھنا پسند کرتا ہوں کیونکہ میں پیوند کاری میں ماہر ہوں۔ یہ کہانی بھی ٹکڑوں میں ہی بیان کرنے جا رہا ہوں۔ آپ میرا یقین کریں کہ یہ ٹکڑے خوبصورتی سے جڑ جائیں گے اور کہانی بن جائے گی۔ ایک کہانی ..... کئی ٹکڑے۔ چھوٹے بڑے، غیر ضروری، ضروری .... ٹکڑے — اور یہ پہلا ٹکڑا .....

..... ایک نوخیز دوشیزہ۔ بھرے بھرے جسم والی۔ چھاتی پر دو کچی ناشپاتیاں۔ انگ انگ میں گلاب کی مہک۔ اپنے وجود کے جنگل کو ہرا ہوتے دیکھ رہی یہ لڑکی .... ایک دن لہلہاتے کھیتوں میں سبز کھیرے توڑنے گئی — یہاں ذرا رک جائیں کیونکہ اس پہلے ٹکڑے کا دوسرا حصہ اب یہاں نہیں جڑے گا۔ اس لئے اب کہانی کا دوسرا ٹکڑا پڑھیے —

ایک دریا کا جوانی کے خمار میں سرکش، چڑیوں کا شکاری ایک شہسوار لڑکی کو کھیت

میں جاتے دیکھ کر اپنے بل سے نکلا اور لڑکی کے سامنے کنڈلی مار کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ بڑبڑایا۔ پھر اُس نے گردن لمبی کی اور لڑکی کو ڈسنے کے لیئے مونہہ کھولا۔ لڑکی نے منت سماجت کی۔ شور مچایا۔ زبردست مزاحمت کی۔ لیکن سانپ ڈنک مار گیا۔ چڑیا شکار ہو گئی ــــ لڑکا سبز جنگل کو تباہ کر کے اپنی بڑی حویلی میں چلا گیا۔ اور لڑکی.... کہ جس کے سانولے حسن کو دوبالا کرنے والی ناک کی نتھنی اُتر چکی تھی۔ کچی ناشپاتیوں پر جا بجا ناخن اور دانت گڑے ہوئے تھے اور موٹی سرمئی آنکھیں دھندلا کر پلکوں میں سما گئی تھیں۔ ہاں! وہ لڑکی..... نوچے ہوئے جسم کو سمیٹے آسمان کا بوجھ اُٹھائے.... بوجھل قدموں سے روتی بلکتی اپنی جھونپڑی میں چلی آئی ــــ

لڑکی کو اُجڑا دیکھ کر ایک کہرام مچا۔ جھونپڑی میں زلزلہ آیا۔ ذہن و دل کو سخت دھکا لگا۔ جھونپڑی کا زلزلہ بستی میں پھیل گیا.... بستی درد سے کراہنے لگی۔ پھر درد کے دریا میں طغیانی آ گئی۔ بستی والے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ وہ حویلی والے لڑکے کے خلاف زور دار مظاہرہ کرنے لگے۔ انہوں نے تھانہ میں رپورٹ درج کرائی۔ بات اعلیٰ کرسیوں تک پہنچی۔ بستی میں پولیس آئی۔ لڑکی کا بیان لیا گیا۔ پولیس نے اُس کی تار تار قمیض، پھٹی انگیا، خون میں رنگی شلوار اپنی تحویل میں لے لی اور لڑکی کا نوچا بدن ڈاکٹری معائینہ کے لئے بھیج دیا گیا۔ لڑکے کو گرفتار کر لیا گیا ــــ گواہوں کے بیانات لیے گئے۔ شہادتیں مکمل کی گئیں ــــ اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۶ کے تحت چالان سیشن کورٹ میں پیش کر دیا گیا ــــ

اور یہ کہانی کا تیسرا اور اہم کردار ــــ فاروق.... سیشن کورٹ کا جج ــــ عدالت کی کرسی پر بیٹھا۔ انصاف کا ترازو ہاتھ میں لیئے عدل تول رہا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ اُس نے کبھی کرسی پر بیٹھے ہوئے کبھی کم یا زیادہ تول کر اپنے ضمیر کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ اپنے آپ کو عادل سمجھنے والا یہ جج انصاف پروری کے لئے شہر میں خاصا مشہور ہے۔ پانچ وقت کا نمازی، متقی، پرہیزگار، مجسم حق و صداقت کا مجسمہ.... فاروق

—— چالان کی مسِل ہاتھ میں لئے اوراق الٹ پلٹ رہا ہے —— فردِ جرم لگائی جاتی ہے۔ عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے بھرا ہے بھونچال سے متاثرہ جھونپڑیوں والے، مسلی کچلی لڑکی —— لڑکے کے خاندان والے۔ ان کے دوست احباب، شہر کے معززین و وکلاء۔ اخباری نامہ نگار۔ فوٹوگرافر۔ اعلیٰ سوسائٹی کے ترجمان —— اور سپاہیوں کی حراست میں اندر داخل ہونے والا لڑکا.... پریشان حال، اترا چہرہ، جھکی گردن، پشیمانی کی مورت —— جج نے مقدمے کی کاروائی شروع کرنے کا اعلان کیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ وکیلِ استغاثہ نے بحث کا آغاز کیا اور لڑکے کے جرم کی تفصیل پڑھ کر سنائی۔ اپنے بیان کے ثبوت میں سرکاری وکیل نے عدالت کو لڑکی کا آسیب زدہ جسم دکھایا۔ خون آلودہ شلوار، پھٹی قمیض اور لوٹی انگیا، گواہوں کے بیانات اور ڈاکٹری معائنے کی رپورٹ .... عدالت میں پیش کی.... اور اپنی کرسی پہ جا بیٹھا —— جج نے ملزم کی طرف دیکھ کر بارعب آواز میں کہا۔

"ملزم کھڑا ہو کر اپنا نام، ولدیت، عمر، پیشے اور سکونت کے بارے میں عدالت کے سوالوں کا جواب دے"

یہ حکم سن کر ملزم اٹھا۔ پولیس کے دو سپاہیوں نے اس کو اس کٹہرے میں کھڑا کیا جو جواب دہی کے لئے بنایا گیا ہوتا ہے۔

"میرا نام آفتاب عالم خان ولد خان بہادر شان محمد خان ہے میری عمر ۲۴ سال ہے ہم محلہ نواباں میں رہتے ہیں اور تجارت ہمارا پیشہ ہے۔"

جج نے چند منٹ تک مقدمے کی مسِل کا معائنہ کیا اور پھر ملزم کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم پر الزام ہے کہ تم نے مریم بی بی دختر فقیر محمد عرف فقیرو ساکنہ بستی شیخان عمر ۱۶ سال سے زنا بالجبر کیا ہے۔ وکیل استغاثہ کی طرف سے پیش کردہ گواہان کے بیانات، ڈاکٹری رپورٹ اور جائے واردات سے لئے گئے دیگر ثبوت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے مریم بی بی پر مجرمانہ حملہ کر کے اس کی عصمت لوٹی ہے۔ یہ جرم تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۶ کے تحت قابلِ سزا ہے اور اس میں تمہیں دس سال تک قید بامشقت کی سزا ہو سکتی ہے۔ کیا تم اقرار کرتے ہو کہ

تم نے یہ گھناؤنا جرم کیا ہے۔؟!"

"نہیں! میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

کمرہ عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ جج میز پر زور سے ہاتھ ملتا ہے اور کہتا ہے
۔"خاموش! خاموش!"۔ لوگ چپ ہو جاتے ہیں۔ جج پھر مخاطب ہوتا ہے۔

"کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"۔

وکیل صفائی اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور جج سے کہتا ہے۔

"جناب والا! میرا موکل بے قصور ہے۔ اس پر غلط الزام لگایا گیا ہے ہم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں اور آپ سے انصاف کے طلب گار ہیں۔"

عدالت کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ مقدمہ اگلی پیشی تک ملتوی کر دیا گیا ہے اس میں استغاثہ کے گواہان پیش ہوں گے۔ ان کی شہادتیں لی جائیں گی۔ وکیل صفائی ان پر جرح کرے گا۔ اور اگلی پیشی بہت دور ہے۔ تیسرے مہینے کی آٹھویں تاریخ۔۔۔ اور۔۔۔۔ خان بہادر شان محمد خان نے اپنے لخت جگر کی ضمانت کرالی ہے۔ وہ واپس حویلی میں آگیا ہے۔

اس بیچ خان بہادر بستی کی رنگ برنگی بھیڑ بکریوں میں سے کچھ کالی بھیڑیں خریدنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ تاکہ کالی بھیڑوں کے ذریعہ مریم بی بی اور اس کے باپ فقیرو کے گلے میں دھن کا لالا ڈال کر ان کا موہنہ بند کرا دیا جائے، کیونکہ خان بہادر کی نظر میں مریم کی حیثیت کسی دیہاتی نوچی یا شہر کے مہندی بازار کی تریا سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اپنے فرزند ارجمند کے ہاتھوں اس کی نتھ کھلائی کی قیمت، پانچ ہزار تک دینے کو تیار ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پانچ ہزار روپے جھونپڑی کا نقشہ بدل دیں گے۔ مریم آسانی سے بیگم بن جائے گی ۔۔ لیکن مریم کے باپ نے دھن کی اونچی سیڑھی پر لٹکے خان بہادر کے موہنہ پر نفرت سے تھوکتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ لڑکیوں کی عزت کا سودا نہیں کیا کرتے ۔۔۔ خان بہادر کی سبھی کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔۔ مقدمہ کی تاریخ آن پہنچی ہے۔

آواز لگتی ہے ـــــ" سرکار بنام آفتاب عالم خان ..... حاضر ہے ۔" دونوں پارٹیاں۔ عدالت میں حاضر ہوتی ہیں۔ کمرہ کچھا کھچ بھرا ہے۔ سرکاری وکیل پہلے مریم پھر دیگر گواہوں کو پیش کرتا ہے۔ سبھی لگ بھگ وہی بیان جج کے روبرو دیتے ہیں جو وہ تحریری طور پر دے چکے ہیں ــ مریم اپنے ساتھ بیتی واردات کو دہراتے ہوئے ... پہلے تو شرماتی ہے "ہچکچاتی ہے پھر رو پڑتی ہے۔ آنسو اور جذبات ہم رشتہ ہو جاتے ہیں۔ اندر کا کرب چہرے پر اُبھر آتا ہے کانپتی آواز بلند ہوتی ہے۔

"جج صاحب! یہ کس بات کا بدلہ لیا اِس بدمعاش نے مجھ سے یہاں کب تک عورت کی عزت لٹتی رہے گی۔"

رندھے ہوئے گلے سے ایک آواز اُبھرتی ہے یہ مریم کا باپ فقیرو ہے جو جج سے کہہ رہا ہے "میری عزت کی سفید چادر اِس لٹیرے نے داغدار کی ہے۔ جج صاحب! اس چادر کو دھو دیں۔ میری عزت کو بحال کر دیں۔ ملزم کو سخت سزا دیں۔ ہمارے ساتھ انصاف کریں۔ اللہ آپ کا اقبال بلند رکھے گا۔" کرم دین عرف کرمو اور ہری چند عرف ہریا نے اپنے بیانوں میں کہا ہے کہ انہوں نے چھوٹے خان صاحب کو اپنی آنکھوں سے کھیت سے نکلتے دیکھا اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے سانس پھولا ہوا تھا پتلون کو گیلی مٹی لگی ہوئی تھی۔ گریبان چاک تھا۔ بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ حویلی کی طرف جا رہا تھا ــ مریم نے انہیں روتے بلکتے بتایا تھا کہ حویلی والوں کے لڑکے نے اُس کی عزت لوٹی ہے۔ اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اوڑھنی چھلنی تھی ـــ باقی گواہوں نے بھی پہلے سے لکھوائے گئے بیانات کی توثیق کی۔

وکیلِ صفائی نے مریم اور استغاثہ کے گواہان سے جرح کرتے ہوئے بہت سے سوالات کئے۔

"مریم بی بی! کیا تم وثوق سے کہہ رہی ہو کہ تم سے منہ کالا کرنے والا یہی شخص تھا ـــ جو کٹہرے میں کھڑا ہے اور جس کا نام آفتاب عالم خان ہے یا وہ کوئی اور تھا ۔؟"

"جی! یہی کمینہ تھا۔ اسی کتے نے میرے جسم کو نوچا اور میری عزت لوٹی۔"

"کیا اس وقت وہاں کوئی اور بھی تھا یا تم دونوں اکیلے تھے؟"

"جی میں اکیلی کھیت میں گئی تھی کہ یہ کلموا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس وقت وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ میں بہت چلائی، روئی، پیٹی، لیکن میری آواز کسی نے نہیں سنی۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موقع کی شہادت کوئی نہیں ہے۔ پھر تم کس طرح ثابت کرسکتی ہو کہ آفتاب عالم نے ہی تمہاری عصمت دری کی ہے؟"۔۔۔ سرکاری وکیل بیچ میں بول پڑتا ہے "میرا فاضل دوست مستغیثہ کو غیر ضروری سوالوں میں اُلجھا رہا ہے۔ جج صاحب! کوئی بھی لڑکی، خواہ وہ کنواری ہو یا بیاہی، جان بوجھ کر بدنامی کا کلنک اپنے ماتھے پر نہیں لگا سکتی۔ کیا مریم کا نوچا ہوا بدن، ڈاکٹری رپورٹ اور ملزم کا گناہ آلود چہرہ ثبوت کے لئے کافی نہیں"۔۔۔ وکیلِ صفائی نے گواہوں سے بھی کئی آڑے سیدھے سوالات پوچھے لیکن سبھی اپنے اپنے بیانوں پر اڑے رہے۔۔۔ بعد ازاں صفائی کے وکیل نے اپنے گواہوں کو عدالت میں پیش کیا، جن کا کہنا تھا کہ واردات کے روز چھوٹے خان صاحب پورا دن فیکٹری میں تھے۔ سرکاری وکیل نے اپنی جرح میں ملزم کے گواہوں کا پول کھول کر رکھ دیا..... اور عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ گواہوں کے بیانات مکمل ہوچکے تھے، لہٰذا مقدمہ کے فیصلے کی تاریخ چار روز بعد مقرر کی گئی۔

مسجدوں، خانقاہوں، مندروں، گوردواروں اور کلیساؤں کے گنبد اور میناروں والا یہ شہر، جس میں بستی شیخاں کی جھونپڑیاں بھی ہیں۔ خان بہادروں اور رائے بہادروں کی حویلیاں بھی ہیں .... اور ایک پہاڑی کے دامن میں شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں کلکٹر، جج فاروق کا بنگلہ بھی ہے ۔۔۔ بنگلہ کے لان میں کرسی پر بیٹھا جج .... مریم کے مقدمہ کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ جج کو یقین ہے کہ آفتاب عالم مجرم ہے۔ اس نے معصوم مریم کی عزت لوٹی ہے۔ جج نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ حسبِ معمول عدالت کا وقار بلند رکھے گا اور ملزم آفتاب عالم کو عبرت ناک سزا دے گا۔۔۔ باہر گھنٹی بجتی ہے۔ نوکر دروازہ کھولتا ہے۔ اندر آنے والے ڈرائنگ روم میں بٹھائے

جاتے ہیں۔ نوکر لان میں جج فاروق کو مطلع کرتا ہے کہ اُس سے تین افراد ملنے کے لئے آئے ہیں۔ جج اٹھتا ہے اور ڈرائنگ روم میں آتا ہے ۔۔۔ ملزم کا باپ خان بہادر شان محمد خان، سٹی زن کونسل کے چیرمین اور قانون ساز اسمبلی کے معزز رکن رائے بہادر دولت رام اور مشہور سوشل ورکر کامریڈ اجیت سنگھ جج سے اٹھ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ فاروق ان کے آنے کا سبب جانتا ہے پھر بھی پوچھتا ہے "فرمایئے! آپ نے کیسے زحمت گوارہ کی" جواب میں رائے بہادر دولت رام اور کامریڈ اجیت سنگھ خان بہادر کے لڑکے کی سفارش کرتے ہیں اور اسے باعزت بری کرنے کے لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ خان بہادر کی عزت کا سوال ہے۔ اُن کے پرکھوں کی عزت کا سوال جس کے خاک میں ملنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

"اس میں سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پورا انصاف کروں گا" رائے بہادر جج کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بے سود، کامریڈ سنگھ جج کو دھمکی دیتا ہے لیکن بے کار ۔۔۔ جج انہیں چلے جانے کے لئے کہہ دیتا ہے ۔۔۔ بات اعلیٰ کرسیوں تک پہونچتی ہے۔ جج پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے لیڈر، وزیر، افسر سفارش کرتے ہیں۔ غنڈے بدمعاش دھمکیاں دیتے ہیں ۔۔۔ ٹیلیفون کی گھنٹیوں کا شور بڑھنے لگتا ہے ۔۔۔ آوازیں ..... سیلاب کی لہروں کی طرح حملہ آور ہوتی ہیں ۔۔۔ جج الجھنوں کے جال سے باہر نکلنے کے لئے نماز پڑھتا ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ لیکن بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ روح پر چھائے ہوئے گھنے بادل پگھلنے کا نام نہیں لیتے۔ اور من کی ندی میں بہت شور ہے ۔۔۔

آج مقدمہ کا فیصلہ ہے۔ وکیلِ استغاثہ نے خوش اسلوبی سے کیس پیش کیا ہے۔ دلائل مظبوط ہیں اور پھر جج فاروق کی انصاف پروری ..... اسے یقین ہے کہ فیصلہ اُن کے حق میں ہوگا اور ملزم آفتاب عالم کو سزا ہو جائے گی۔ سرکاری وکیل نے مریم، فقیر ڈکرو اور بستی والوں کو یقین دلایا ہے کہ آفتاب عالم کو سخت سزا ملے گی کیونکہ سارا کیس اُس کے خلاف گیا ہے ۔۔۔ کمرۂ عدالت میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے۔ کمرے میں شور مچا ہے،

لیکن جج کے اندر داخل ہوتے اور عدل کی کرسی پر بیٹھتے ہی شور یکبارگی تھم جاتا ہے۔
جج مقدمہ کا فیصلہ سنانے لگتا ہے۔ اُس کی آنکھیں میز پر پڑے کاغذ پر جھک جاتی ہیں۔
"ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ مریم بی بی دختر فقیر محمد عرف فقیرو کی عزت لوٹی گئی ہے۔ مریم اور دیگر گواہوں کے بیانات کے مطابق یہ بھی سچ ہے کہ مریم کی عزت کھیت میں لوٹی گئی ہے۔ لیکن استغاثہ یہ ثابت نہیں کر سکا کہ مریم سے زنا بالجبر آفتاب عالم نے کیا ہے۔ کیونکہ موقع واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔ لہٰذا عدالت ملزم آفتاب عالم کو باعزت بری کرتی ہے"
فیصلہ سنانے کے بعد جج اپنی جھکی نظروں کو کوٹ کی جیب میں ڈال کر کرسی سے اٹھنے لگتا ہے۔
— قارئین! ذرا رکئے — یہاں کہانی ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے کہانی کا ایک اور ٹکڑا شروع ہوتا ہے جو کہانی کو کلائمیکس پر لے جاتا ہے اور کہانی میں جان پیدا کرتا ہے۔
ایک آواز کمرۂ عدالت میں گونجتی ہے اور بکھر جاتی ہے —
"ٹھہریئے جج صاحب ... ٹھہریئے جج صاحب .... ٹھہریئے جج صاحب —" سبھی سکتہ میں آجاتے ہیں — پھر مریم کے آسیب زدہ جسم کی پسلی سے ایک ننھے سایے کا جنم ہوتا ہے۔ جو دیکھتے دیکھتے پھیل کر قد آور عورت میں ڈھل جاتا ہے اُس کی آنکھیں جج فاروق کے چہرے پر اٹک جاتی ہیں۔ زبان تیز اور نوکیلے دانتوں میں جکڑی جاتی ہے .... لیکن ہونٹ سلگتی آگ کا دھواں چھوڑتے ہیں اور دھواں آواز کا بہروپ لئے ہوئے ہے۔
"ٹھہریئے جج صاحب! آپ کا نام فاروق ہے اور میرا — جج صاحب مجھے پہچانیئے۔ میرا نام صرف مریم نہیں ہے۔ سیتا ہے۔ دروپدی ہے۔ ہر یگ میں میری عزت پر حملہ ہوا ہے۔ مجھے رسوا کیا گیا ہے۔ مگر تب انصاف کا ترازو کم اور زیادہ نہیں تولتا تھا۔ تب عدل .... بکرما جیت تھا .... نوشیروان تھا۔ عمر فاروق تھا — لیکن آج انصاف کے ترازو میں زنگ لگ چکا ہے۔ آج وہ سبھی چہرے مسخ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کئی کروٹیں بدلی ہیں .... اور نیا یگ شروع ہوا ہے۔ — پر مجھے وہ خوبصورت اور باوقار چہرے ابھی تک یاد ہیں — اُن میں سے صرف ایک

چہرے کا عکس آپ کو دکھا رہی ہوں ۔۔ یہ بیتے کل کی بات ہے ۔۔ فاروقِ اعظم ......
عدل کی کرسی پر بیٹھا ایک جج اور میں .... میں تب مریم نہیں تھی، سیتا بھی نہیں، دروپدی بھی
نہیں بلکہ ایک یہودی لڑکی تھی۔ اُن دنوں بھی میری عزت لوٹی گئی تھی۔ مجھ سے زنا بالجبر کیا
گیا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو ۔۔ میرے ہرے جنگل کو تباہ کیا گیا تھا ..... اور تباہ کرنے والا کوئی
اور نہیں تھا۔ حضرت عمر کا اپنا خون تھا۔ اُن کا بیٹا ..... ابو شحمہ، میرے پاس تب بھی کوئی ثبوت
نہیں تھا۔ موقع واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ لیکن میرا بیان تھا۔ ایک عورت کا بیان ..
.. جو کبھی خود کو رسوائی کی اندھی کھائیوں میں غرق نہیں کر سکتی ۔۔ اور فاروق اعظم نے میرے
بیان کی تصدیق کر کے جو تاریخی فیصلہ سنایا تھا، وہ انسانی زندگی کے لئے مشعلِ راہ بننا چاہئے
تھا۔ لیکن افسوس ۔۔ وہ فیصلہ تاریخ کی کتابوں میں دفن کر دیا گیا ۔۔ انہوں نے اپنے بیٹے
کو ۔۔ نہیں، نہیں .... ایک مجرم کو سو کوڑوں کی سزا دی تھی۔ مجرم ابھی ساٹھ کوڑے بھی نہ کھا پایا
تھا کہ مر گیا۔ حکم ہوا کہ باقی کوڑے مجرم کی قبر پر لگائے جائیں۔

سلگتے دھوئیں کی پر اسرار آواز سے کمرۂ عدالت میں ایک گہرا شگاف پڑ گیا اور مریم کی پسلی سے
جنم لینے والا سایہ مریم کو ساتھ لے کر اس میں سما گیا ۔۔ اور جج فاروق .... ایک مفلس، قلاش،
سب کچھ لٹا کے کرسی سے اٹھا اور رنگین میناروں والے شہر میں گم ہو گیا ۔۔۔

قارئین! آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ بتائیے نا، اِن ٹکڑوں کی پیوندکاری سے کہانی
بنتی ہے .... یا نہیں ؟

معاوضہ

بلوے میں مرنے والوں کے لواحقین کو سرکار کی طرف سے

پانچ پانچ ہزار روپے معاوضہ دینے کا اعلان کیا گیا ——

مرنے والوں میں چوہدری مقبول حسین کا فرزند

ڈاکٹر اصغر علی بھی تھا......

کہ جس کی شادی کے لئے چوہدری صاحب.....

کوٹھی، کار اور دو لاکھ روپئے نقد

معاوضہ مانگا کرتے تھے ——

انتظار کا قیدی

میں ایک قیدی ہوں۔ کال کوٹھری میں قید..... اور قید کے یہ طویل دن الگ الگ
دائروں میں دھیرے دھیرے گردش کرتے رہتے ہیں نفسیاتی پریشانیاں، کبھی آدامو
.... کبھی دُکھ ..... کبھی درد ــــ اور دائروں میں گردش کرنے کے بعد من بہت بے چین
ہو جاتا ہے۔ شدت کے ساتھ ایک انتظار لگا رہتا ہے..... کہ اب کوئی آئے ..... اپنا یار
دوست یا دشمن۔ کوئی گفتگو ہو..... لیکن کس کے ساتھ۔ اِس کال کوٹھری کی دیواروں کے ساتھ
یا اپنے قیدی ساتھیوں کے ساتھ ..... جو میری ہی طرح اِس جیل میں بند کر دیئے گئے ہیں
جانوروں کی طرح ہم تو جانوروں کی ہی اولاد ہیں۔ آن انسان نما بھیڑ بکریوں کی، جو کوڑیوں
کے مول خریدے گئے تھے۔ یہ بہت پرانی داستان ہے۔ پر کیا ہوا.....؟ ہماری خصلت اب
بھی نہیں بدلی۔

یہ جیل کسی بے درد حاکم کا ماتم کر رہی ہے۔ سامنے اونچی پہاڑی بنا قلعہ.... تلوار کے زور

کا محافظ ـــ آج کے زمانہ پر رو رہا ہے۔ یہ جیل ایک عجیب دُنیا ہے۔ یہاں نہ زندگی کا وجود ہے نہ موت کا۔ یہاں وہ جیتے جاگتے لوگ .... جو ہنستے، روتے، پیار کرتے اور لڑتے ہیں .... سب الف لیلہ کی داستان بن جاتے ہیں اور اِس داستان کا ایک قصہ میں بھی ہوں .... میں ملزم ہوں..... قتل کا۔ مجھ پر الزام ہے کہ میں نے قتل کیا ہے۔ لیکن مجھے انکار ہے۔ ایک بار نہیں، سو بار انکار ہے۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔ اگر میں نے قتل کیا ہے تو پھر وہ لاش کہاں ہے۔ جس کا قتل میرے ہاتھوں ہوا۔ مگر جو خود ایک گلی سڑی لاش ہو، وہ قتل کو کیونکر ثابت کر سکتا ہے ـــ مجھ پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ ایک سال گزر چکا ہے۔ کیا ہوا ـــ فوجداری اور دیوانی مقدمات کو تو کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ ابھی تو استغاثہ والوں کی گواہی ختم نہیں ہوئی۔ اِس ماحول میں میری باری .... اللہ جانے کب آئے۔ ایسے لگتا ہے جیسے وقت کی اپنی کوئی قیمت ہی نہیں۔ اپنا کوئی وجود ہی نہیں۔ بس فقط یہ دن اور رات .... بار بار اس گلوب پر گھومتے رہتے ہیں۔ اگر وقت اپنی حقیقت کھو بیٹھے تو پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پر وقت اپنی حقیقت نہیں بدلتا۔ وہ تو تلخ اور شیریں حقائق کا ایک لمبا سفر ہے۔ کانٹوں اور پھولوں سے بھرا ہوا۔ لیکن میرے راستہ میں کانٹے ہی کانٹے آگتے رہے۔ یہاں پھول کبھی نہیں آگ سکتے ـــ کیا معلوم .... کبھی آگ بھی جائیں۔ لالہ کے پھول۔ سرخ کٹوروں کی طرح .... ایرانی شاعری کے من پسند پھول شیکسپیر کی جولیٹ کہتی ہے کہ آنے والے وقت میں ہمارے سبھی غم بڑی میٹھی گفتگو کا سامان بنیں گے۔ اِس لئے جو رات بیت جاتی ہے، وہ ماضی میں دفن ہو جاتی ہے۔ صرف آنے والا دِن زندہ ہے اُس کی اُمید زندہ ہے۔ اُس اُمید کا گیت زندہ ہے۔ اُس آنے والے دِن کا جشن مناؤ، دوستی اور محبت کے سرمائے کو خرچ کر کے۔ وہ دِن، وہ وقت .... جب روحوں کا قتل نہیں ہو گا ـــ اور مجھ پر الزام ہے قتل کا۔ مگر میں ہتھیارا نہیں ـــ استغاثہ والوں نے جرم ثابت کرنے کی خاطر کافی شہادتیں پیش کی ہیں۔ اِن کا کہنا ہے کہ میں نے ایک لاش کا قتل کیا ہے اُس

کا سر قلم کیا ہے اور اُس کے دماغ میں کیڑے بھر دیئے ہیں۔ اُس کے دِل پر لگی پلاسٹک پر
کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ بھلا لاش کا قتل کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے لیکن
جھوٹ سچ بن جاتا ہے اور سچ .... جھوٹ۔ اسلئے میں بہت دُکھی ہوں۔ ایک درد .... ایک
تکلیف میں جی رہا ہوں۔ حیوانی درد کا علاج موت ہے۔ کیونکہ بے زبان مخلوق اپنی بے کسی
بیان نہیں کر سکتی۔ مگر انسان تو درد کو لے کر جیتا ہے۔ کئی برسوں تک۔ صدیوں تک۔ نسل
اُس کے درد کا علاج موت نہیں .... زندگی ہے۔ اور زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ پر جدو
.... ہمارے لئے کوئی اور کرے۔ ہم نہیں کر سکتے۔ ہم لنڈی مسجد کے نمازی ہیں اور گونگے کا
خواب دیکھ کر دِل ہی دِل میں پچھتانے والے .... اور زندگی جدوجہد کے بغیر، اس جیل میں
بور لگتی ہے چنانچہ بوریت مٹانے کے لئے چیخوف، فرائڈ، موپساں، گگول، سومرسٹ ماہم، ٹالسٹائی
اور جانے کِس کِس کمبخت کو پڑھنا پڑتا ہے۔ کافکا کی ڈائری پڑھ کر .... بہت کچھ یاد آجاتا ہے
باغات میں کھلے پھول، دو شامیں جو امیرا کدل سے لے کر کافی ہاؤس تک بکھری ہوئی ہیں۔
وادی کے شگوفے، ڈل کے رنگ برنگے شکارے۔ بلیوارڈ کی اتھر سٹرک۔ اُس پر چلتے
زندگی کو حسین بنانے کے منصوبے۔ براڈوے اور خیام میں دیکھی فلمیں سن فلاور، ریڈ بیج
زیواگو، ہنڈرڈ رائفلز، اچانک، اُپہار، گرم ہوا، کوشش، گھر اور بے شمار فلمیں۔ جہلم کا بند۔ گلمرگ
سبزہ زار۔ فیروز پور نالے کا پانی۔ یوسمرگ کے جنگل .... ورڈس ورتھ کی شاعری۔ کسی بڑا
بابا کی سفید داڑھی کی مانند چمک رہی اونچی پہاڑیوں پر برف ــــ بہت دیر تک یاد .... بسا
بن کر میرے ذہن و دِل پر لوٹتی رہتی ہے ــــ پھر سب کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دوپہر کا
پریشان، گرد آلود، فضول سا شدت کی گرمی لیکن جب ہوا سرسراتی ہے تو جیل کے احاطے، درخت
کی لتے پر آہستہ آہستہ رقص کرنے لگتے ہیں۔ کال کوٹھری میں بیٹھے .... کئی مناظر اُبھرتے ہیں، ہوا
لہراتے ہیں .... اور بکھر جاتے ہیں۔ پھر ہر منظر جیل بن جاتا ہے۔ وہ جیل جس میں میں قید ہوں۔ قتل
الزام میں .... قتل ایک لاش کا، ایک جسم سے سر جدا کرنے کا، دِل کی پلاسٹک سرجری توڑنے کا۔

یہاں آنے سے پہلے بھی مجھ پر الزام لگتے رہتے تھے۔ گلیوں، بازاروں میں، کھیتوں کھلیانوں میں، مشینوں کی چمنیوں میں دھواں پھیلانے کے الزام۔ اور کبھی کبھی یہ الزام زنجیروں کی جھنکار بن کر اپنے وجود کا گہرا احساس دلاتے رہتے تھے۔ مگر میں ہر وقت الزاموں کے سیلاب سے بخیریت گزر جاتا۔ لیکن اب تو الزام قتل کا ہے ۔۔۔۔ اور قتل کی سزا موت ہے ۔۔۔ موت ۔۔۔۔ پھانسی کا پھندہ یا فائرنگ سکاڈ کی ایک گولی ۔۔۔ اور قتل کا یہ الزام دن رات ۔۔۔ میرے دل اور دماغ میں گونجتا رہتا ہے۔ ڈستا رہتا ہے۔ پھر بھی اس پراگندہ ماحول میں من کا موسم کبھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ۔ پھر رات کا چاند، آسمان کی ریشمی چادر پر انگ انگ لہراتی چاندنی، کوئل کی کوک ۔۔۔۔ بہت اچھی لگتی ہے۔ اور کیٹس کا قول یاد آجاتا ہے کہ حقیقت حسن ہے اور حسن حقیقت۔ اُس وقت حسن کی حقیقت دل کو جیل سے بہت دور لے جاتی ہے ۔۔۔۔ دیودارون اور آبنوس کے درختوں کی خوشبوئیں۔ ندیوں کے مدھر سنگیت میں۔ پھر دل یہ نہیں مانتا کہ میں جیل میں ہوں قتل کے الزام میں ۔۔۔۔ کال کوٹھری میں۔ کاش میری کال کوٹھری پر بجلی گرے۔ ایک خوفناک آواز آئے حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کی آواز سے بھی بھیانک ۔۔۔۔ وہ آواز جس سے چٹانیں اور ہزاروں ٹن وزنی برف کے تودے لڑھک جائیں۔ پہاڑوں کی بنیادیں ہل جائیں ۔۔۔ لیکن ہمارے لوگوں کے بے حس وجود ۔۔۔۔ پہاڑوں سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ ان کو شاید کوئی ایٹم بم بھی نہیں ہلا سکتا۔ میں روز علی الصبح جاگتا ہوں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ۔ پھولوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، ہوا کا سنتور بجنا ۔۔۔ پھر سورج قلعہ کی اونچی دیواروں سے باہر نکل آتا ہے ۔۔۔۔ جیل خانہ جاگ اٹھتا ہے۔ اور دل پھر اداس ہو جاتا ہے۔ کبھی اپنے کی یاد بہت ستاتی ہے ۔۔۔ اور جب کوئی اپنا ملاقاتی آجائے تو بڑی خوشی ہوتی ہے مل کر۔ مگر ملاقات کے بعد اکیلے پن کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کچھ ڈھونڈتی ہیں۔ کچھ کھویا ہوا۔ پھر طویل اور بے رنگ راتیں، ویران اور اجڑے دن، کھانے کو آتے ہیں۔ پھر یہ جیل، جیل کی اونچی دیواریں، پہریدار، دردیاں، سلاخیں ۔۔۔۔ دائرے گردش کرتے رہتے ہیں ۔۔۔

کل میرا وکیل آیا تھا۔ مقدمے سے متعلق باتیں کرتا رہا۔ کچھ کاغذات پر دستخط کروا کر لے گیا۔ جاتے جاتے کان میں دھیرے سے کہہ گیا — "ہواؤں کا چلنا بند کر دیا گیا ہے۔ دریاؤں کا بہنا، ندیوں کا مچلنا، پھولوں کا کھلنا، پرندوں کا اُڑنا.... سب بند کر دیا گیا ہے" — اور میرے ذہن میں کافی دیر تک قتل گونجتا رہا.... قتل.... قدرت کے بخشے ہوئے حقوق کا قتل۔ لیکن وہ کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ وہ تو عالم پناہ ہے۔ قاتل تو ہم ہیں.... اِس جیل قیدی —

جیل میں اُداسیاں اور بدنصیبیاں بہت ہیں — پر جینے کی خاطر ہنسنے کے لئے دِل لگانے کے لئے.... لتا اور طلعت کے پرانے فلمی نغمے، مہدی حسن، غلام علی، طاہرہ سید کے گیت اور غزلیں۔ شوکت، اور یونس کی آوازوں میں سیف الملوک اور ہاشمی ہاشم کے دوہے سننے کو مل جاتے ہیں۔ کل طاہرہ سید بچوں کی ایک لوری گا رہی تھی — "اللہ اللہ کریا کرو۔ خالی دم نہ بھریا کرو" — اور مجھے لگا کہ میں ایک بچّہ.... لہروں کی طرح چنچل اور پھولوں کی طرح نازک طاہرہ سید کی گود میں بیٹھا لوری کی مست آوازوں میں ڈوبا، سو رہا ہوں.... کہ سوتے ہوئے بچّے کو ریشماں کی لوچ دار آواز نے جگا دیا۔

"ہائے او ربّا نئیں اوں لگدا دِل میرا......"

کبھی کبھی کوئی اچھا ڈرامہ بھی سُننے کو مِل جاتا ہے۔ کچھ دن ہوئے... فلسطینی مجاہدوں کے کارناموں پر ایک ڈرامہ نشر ہوا، کہانی، مکالمے، آوازیں، ہر لحاظ سے ایک عمدہ ڈرامہ تھا۔ یہودیوں کی بربریّت کی داستان.... جو کبھی خود بھی مظلوم ہوا کرتے تھے.... اور اُن کے ہاتھوں فلسطینیوں کے قتلِ عام کی کہانی — لیکن ہمارے ہاں.... قتلِ عام نہیں ہوتا۔ قتل کے الزام لگتے ہیں — یہاں گونگے گُڑ کھا کر سو جاتے ہیں۔

— کل ایک بڑا سایہ ہماری جیل میں داخل ہوا، کئی چھوٹے چھوٹے سایے ہمراہ لئے۔ اُس نے ساری جیل کا معائنہ کیا۔ میری کال کوٹھری کی جانب اشارہ کر کے وہ کہنے لگا۔

"اِس کال کوٹھری میں، میں بھی چار برس تک قید رہا ہوں" — پھر وہ بڑا سایہ قیدیوں کے ساتھ بات چیت کرنے لگا۔ بالکل اُسی طرح — جس طرح قید کے ایام میں، اُس کے ساتھ اُٹھ

وقت کے سایوں نے کی ہو گی۔

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟" ۔ جیل میں بھلا کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ جیل تو آرام گھر ہوتا ہے۔ پھر وہ قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ پوچھنے لگا۔

"تم کس جرم میں یہاں آئے؟"

"چوری کے جرم میں۔"

"تم"؟

"دفعہ ۳۰۷ کے جرم میں۔"

"تمہارا کیا جرم ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا کوئی جرم نہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

"پھر تم یہاں کس طرح آئے۔"

"مجھ پر الزام ہے کہ میں نے قتل کیا ہے۔ ایک لاش کا۔ بھلا تم ہی کہو، لاش کا قتل کس طرح ہو سکتا ہے؟ کبھی کوئی مری ہوئی شے کا بھی قتل کرتا ہے۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔ میں ہتھیارا نہیں۔ میں لاشوں کا بیوپاری نہیں۔ چلتی پھرتی لاشوں کا۔ میں تو زندگی چاہتا ہوں۔ قتل نہیں۔ لیکن تم بھی تو اس کال کوٹھری میں چار سال تک قید رہے تھے، تمہارا کیا جرم تھا؟ کیا تم نے بھی کوئی قتل کیا تھا؟"

۔۔۔ بات سنتے ہی وہ چھوٹے سایوں کی طرف دیکھنے لگا، جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے ۔۔۔ پھر جیل کا بڑا پھاٹک کھلا..... اور وہ بڑا سایہ تیز تیز قدم بھرتا باہر چلا گیا..... میرے سوال کا جواب دیئے بغیر۔ اُن کے جانے کے بعد سپاہیوں نے لوہے کا پھاٹک بند کر دیا۔ پر میرا سوال.... میرا سوال.... لوہے کا پھاٹک چیر کر اُس کا پیچھا کر رہا ہے ۔۔ ایک دائرہ بن کر اُس کے آگے پیچھے گردش کر رہا ہے..... اور گردش کرتا رہے گا۔

(نیفرے کی جیل ڈائری سے متاثر ہو کر)

گرداب

کل رات جو تند ہوائیں چلیں، جو طوفان آیا، جو بجلی گری — کیا آپ جانتے ہیں کہ اُس میں کس کس کا گھر اُجڑ گیا؟ نہیں جانتے ....؟ بھلا! آپ کو کیونکر پتہ ہو۔ یہاں کون کسی کی خبر رکھتا ہے۔ یہاں تو سبھی اپنے اپنے شیش محلوں میں مست رہتے ہیں۔ خیر.... آئیے! میں آپ کو بتاؤں کہ کل رات کی آندھی میں جولاہوں کی بستی کا کون کون سا گھر اُجڑا! کہاں کہاں بجلی گری۔ کس کس کی جھونپڑی تباہ ہوئی۔ کن کن مکانوں کی دیواریں گریں۔ ملبے کے نیچے دب کر کون کون مرا — سائیں منگلا! ہاں! وہی جو تعویذ دھاگہ دینے کا دھندہ کرتا تھا اور اللہ ہو کی پھونکیں مارتا تھا.... اُس کا تکیہ سڑھ گیا.... اور وہ چنڈو کے کش لیتا لیتا ہمیشہ کے لئے اللہ ہو ہو گیا — آشاں بین کی جھگی، شیدے ٹھٹھیرے کی جھونپڑی، ملکھی رام کی دکان، غلام پانڈی کا کوٹھا.... سب ڈھیر ہو گئے۔ اور بجلی حاجی ترکھان کے مکان پر بھی گری — جس کے ایک کمرے میں گلاں سوئی پڑی تھی۔ گلاں.... حاجی ترکھان کی چھوٹی بہو۔ نصیرے کی بیوی۔ حاجی کی بھاورج بجلی گرنے سے حاجی کا مکان جلا نہیں۔ گرا بھی نہیں — صرف وہ کمرہ لرز گیا،

جس میں پڑی ایک چارپائی پر گلاں مست نیند میں سوئی ہوئی تھی کیونکہ بجلی سیدھی گلاں پر ہی گری تھی ــ گلاں پر گرنے والی بجلی سے چارپائی کی چولیں ہل گئیں۔ آنگن میں لگا جامن کا پیڑ جیسا پر آندھی اور طوفان کی وجہ سے ٹھنڈ بکھری ہوئی تھی..... اس کی شاں شاں کرتی چیخیں کسی نے نہیں سنیں۔ بجلی اپنا کام کر گئی۔ گلاں کا سارا جسم جھلس گیا۔

ــ گلاں ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ، بہن، بھائی، سب فرقہ وارانہ بلوؤں میں ختم ہو چکے تھے۔ کسی دُور کے ماموں کے گھر پلی گلاں..... نمک، مرچ، آچار کے ساتھ ساتھ باسی سوکھی روٹیاں کھانے اور جھڑکیوں، پھٹکاروں اور گالیوں کی لسّی پینے کے باوجود بھی جنگلی بیلوں کی طرح خوب پھلی ــ جب اس کا جوبن میلے کپڑوں میں بھی اٹھکیلیاں کرنے لگا اور وہ دھرتی پر تارے لٹانے لگی تو اس کے ماموں نے جامی ترکھان کے چھوٹے لڑکے نصیرے کے ساتھ نمکین چائے اور عربی کھجوروں پر گلاں کا رشتہ جوڑ دیا ــ گلاں دلہن بن کر جولاہوں کی بستی میں آگئی۔ وہ نئے گھر اور نئے ماحول میں آکر خوش تھی کیونکہ یہاں اسے پیار ملتا تھا، لیکن کبھی کبھی اس پیار کی گرمی کو نصیرا شرابی بن کر ٹھنڈا کر دیتا۔ جولاہوں کی بستی میں دیسی شراب کی سرکاری دکان کے علاوہ اڑوس پڑوس میں ناجائز شراب کی کئی بھٹیاں ہونے کی وجہ سے ویسے تو سارا گاؤں شراب کا شوقین تھا، پر نصیرا جتنا کھل کر رندا پھیرتا، اتنی ہی کھل کر شراب بھی پیتا۔

گلاں کے روکنے اور ٹوکنے پر اس سے جھگڑا کرنے لگتا۔ اور نشیلے غصّے میں گالیوں سے بھری ٹوکریاں خالی کر دیتا۔ اس طرح گھر کے میٹھے ماحول میں پھیکا پن آجاتا ــ پھر سہاگ کا سرخ جوڑا پھٹنے کے ساتھ ساتھ گلاں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگی۔ یوں گالی گلوچ کے کاگ لڑتے رہتے۔ کبھی کبھار دونوں میں ہاتھاپائی تک کی نوبت آجاتی۔ تھپڑ، مکّے اور لاتیں کھا کر گلاں رونے لگتی اور نصیرے کو جی بھر کے بد دعائیں دیتی۔ نصیرے کی ماں اُسے پکڑتی۔ کبھی اُسے بُرا بھلا کہتی اور کبھی اپنی کوکھ کو کوستی۔ ہمسایے منڈیروں پر چڑھ کر تماشہ دیکھتے۔ آخر گلاں کا جیٹھ جاجی نصیرے کی عقل ٹھکانے لگاتا، اور گھر کی اشانتی کو شانت کر دیتا ــ پھر نہ جانے گلاں

کی کون سی بددعا نصیرے پر اثر کر گئی کہ وہ صرافوں کے گھر الماریاں بنانے کے لئے آرے پر لکڑی کچوانے گیا کہ چلتی مشین کا پٹہ ٹوٹا اور اُس کے بھی ٹکڑے کر گیا — نصیرے کی لاش کو دیکھ کر گلاں نے جو بین کئے اُس سے ساری بستی کا دل ہل گیا۔ وہ چھاتی پیٹنے لگی۔ اُس نے سر کے بال نوچ ڈالے۔ وہ اپنے تین سال کے گلزار اور ایک سال کے یوسف کو بار بار گلے لگاتی اور اُن کی یتیمی کا مرثیہ پڑھتی جاتی۔ لاش کو غسل دینے، کفن پہنانے اور جنازہ لے جانے تک وہ کئی بار بے ہوش ہوئی۔ عورتیں اُسے دلاسہ دیتی جاتیں اور خود بھی روتی جاتیں۔ نصیرا ابھی اٹھائیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرتِ عزرائیل نے اُس کی روح قبض کر لی۔ نصیرے کی بے وقت موت کی وجہ سے اُس کے جنازے میں ساری بستی والے شامل ہوئے۔ کلمۂ شہادت کی آوازوں کے ساتھ جنازہ نکلا اور دعائے مغفرت کے ساتھ نصیرے کو قبر میں دفنا کر لوگ گھروں کو واپس آئے۔ نصیرے کی موت کے کچھ ہی دنوں بعد اُس کی ماں بےچاری بھی اللہ کو پیاری ہو گئی.... اور اس طرح گھر کی حکومت پوری طرح حاجی کے ہاتھ آ گئی ——

گلاں کچھ دیر کے لئے جم سی گئی۔ گھر کی چیزیں، مکان کے کمرے، کمروں کی دیواریں، آنگن میں لگا جامن کا پیڑ.... سب اُسے اپنی طرح اُداس لگے۔ کئی بار اُس کی آنکھوں کے سامنے نصیرے کا چہرہ گھومنے لگتا، جو اُس کے ساتھ باتیں کرتا، اُسے گالیاں دیتا۔ اُسے نصیرے کا شرابی پن، گالیاں، گھونسے، تھپڑ.... سارے کے سب اچھے لگنے لگے۔ وہ چاہتی کہ نصیرا اُسکے سر میں کو نوچے.... لیکن آنکھ جھپکتے ہی گلاں اپنی اصلی حالت میں آ جاتی۔ زندگی کی اس بھیڑ میں وہ باہر سے تو ثابت و سالم دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اندر سے وہ ساری کی ساری ٹوٹی ہوئی تھی — وہ دو بچوں کو کیا کھلائے، اُن کو کہاں لے کے جائے، بیوہ جوانی کے دن کیسے گزارے۔ یہ سوچ سوچ کر اُس کے چہرے کی لکیروں میں بل پڑ گئے۔ وہ فکروں کی جھاڑیوں میں اُلجھ گئی۔ اُس کی آتما پریشان ہو گئی۔ ایسی ہی حالت میں حاجی اُسے تسلیاں دینے لگا۔

گلاں! تو فکر نہ کر۔ نصیرے کے بچے میرے بچے ہیں۔ اِس گھر پر تمہارا ابھی اُتنا ہی حق ہے جتنا کہ میرا۔ میں کماؤں گا۔ پہلے تم سب کھاؤ گے، پھر ہم کھائیں گے“ — حاجی کے اِس ہمدردانہ راگ

میں کئی سمر لئے ہوئے تھے۔ مگر گلاں جاتی بھی کہاں۔ وہ گھر چھوڑ کر در بدر ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اِس لئے وہ صبر شکر کر کے بیٹھ گئی ۔۔۔ لیکن جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ اُس کی حیثیت آٹے کے چھان بورے سے زیادہ نہیں۔ جاجی کی جورو حمیداں ادھرنگ کی ماری کافی عرصہ سے پلنگ پر پڑی تھی۔ مگر اُسکی زبان کو تو ادھرنگ نہیں ہوا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی بیٹھی بھی آئی اگلتی رہتی۔ سچ پوچھیں تو اُس کی زبان تالو کے ساتھ لگتی ہی نہیں تھی۔ جاجی کی بیٹی نیفاں بھی وقتاً فوقتاً جاجی پر جامن کی گٹھلیاں پھینکتی رہتی۔ یوں مٹی کے برتن آپس میں بجتے رہتے۔ ٹوٹتے رہتے۔ پر جب جامن کے پیڑ کے نیچے سایہ نہ رہا اور وہ جامن کھانے میں بالکل مزہ نہیں رہا تو گلاں نے اپنا چولہا الگ کر لیا۔ وہ سینے پرونے کا کام جانتی تھی۔ اِس کے علاوہ کچھ بڑے گھروں میں کپڑے اور برتن صاف کر کے وہ گلزار ے اور یوسف کو پالنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیٹ کا دوزخ بھی بھرنے لگی ۔۔۔۔۔

حمیداں کے ادھرنگ نے جاجی کی ساری شرافت بھنگ کر دی تھی۔ وہ کبھی کبھی ضرورت کے مطابق کھلی چراگاہوں میں جا کر گھاس چر لیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے نصیر اینک خوردوں کے ہاتھوں شراب طہورا پینے بہشت میں چلا گیا تھا۔ تب سے جاجی کا چنچل من گلاں سنگ چنگ بجانا چاہتا تھا۔ اُس کے چہرے پر اپنا سورت کا نشا چاہتا تھا۔ اُس کے ساتھ چادر برداری ایسا کوئی رشتہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ شرع یا قانون والوں کے اعتراض اُٹھانے پر گلاں کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی تیار تھا ۔۔۔ جاجی کئی بار آنکھوں میں خماری رنگ بھر کر اور سوکھے ہونٹوں پر چکنی زبان پھیر کر گلاں کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا۔ گلاں آنکھوں اور ہونٹوں کی بھاشا پڑھ کر چپ رہتی ۔۔۔۔ لیکن ایک دِن جب جاجی نے شراب کے نشے میں گلاں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنے دِل کی بات صاف صاف کہہ دی ..... تو گلاں نے کہرام مچا دیا۔ پاس پڑوس والے ایک بار پھر اپنے چوباروں پر چڑھ کر تماشہ دیکھنے لگے۔ وہ محلے والوں کو سنا رہی تھی۔

"جیٹھ باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ میں اِس کی بیٹی کی طرح ہوں۔ اِس نے یہ بات کہنے کی

ہمت کیسے کی۔ ایسی بات کرتے اسے شرم نہیں آئی۔ اتنی ہی آگ لگی ہے تو اپنی نیفاں سے کیوں نہیں کر لیتا شادی۔ چھوٹے بھائی کی بیوہ پر بری نظر رکھتا ہے۔ خدا کرے یہ کسی گاڑی کے نیچے کٹ مرے۔ حرامی، بدمعاش، سالا۔"

گلاں کو ہنگامہ کرتے دیکھ کر جاجی گھر سے باہر چلا گیا۔ پر جولاہوں کی بستی میں یہ بات پھیل گئی کہ جاجی گلاں کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ محلے کی کچھ عمر رسیدہ اور جہاندیدہ عورتوں نے گلاں کو سمجھایا کہ وہ جاجی کی بات مان جائے تاکہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے۔ لیکن گلاں اپنے جسم کو پھر سلگتے تنور میں پھینکنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ صرف یوسفے اور گلزارے کے لئے جی رہی تھی ورنہ اس کی امیدوں اور تمناؤں کا بستا شہر کب کا کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے دل میں اس کے گھنگھرو بجنے کب کے بند ہو چکے تھے۔ دنیا کی ہر شے اس کے لئے بے کار ہو گئی تھی —— جاجی کو یہ یقین ہو نے پر کہ اس کی خواہشوں کے بادل حسب مرضی بارش برسائیں گے۔۔۔۔۔۔ گلاں کے ٹھنڈے جسم میں پھول نہیں اگ سکتے۔۔۔۔۔ وہ شکرے باز کی طرح اپنے ناخن تیز کرنے لگا تاکہ موقع ملتے ہی وہ جامن کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی کبوتری کا شکار کر سکے —— اور کل سیاہ کالی رات کو تیز آندھی میں جو بجلی گری، وہ انسانی بجلی۔۔۔ جاجی کے روپ میں سیدھی گلاں پر ہی گری تھی جس سے گلاں کا سارا جسم جھلس گیا —— گلاں۔۔۔۔ جو میاں مٹھو کی طرح اپنے آپ کو اس گھر کے پنجرے میں محفوظ سمجھتی تھی، اسے پنجرے میں ہی بلے نے دبوچ لیا۔ کئی دنوں تک گلاں چولہے کی لکڑی کی طرح سلگتی رہی، جلتی رہی —— پھر اس نے جاجی سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے کترے پر پھر اگ آئے —— وہ پنجرے کی سلاخوں سے باہر نکل آئی —— اور اپنے اندر اگا ہوا دھتورا۔۔۔۔۔ جاجی کو کھلانے کے لئے تیار ہو گئی۔

—— جاجی کی بیٹی نیفاں شرع محمدی کے مطابق جوان ہو چکی تھی۔ اس کے شریر پر وہ سارے ہتھیار سج چکے تھے جس سے کوئی بھی شخص زخمی ہو سکتا تھا۔ جبھی تو جاجی نے رشیدے ٹھٹھیرے کے لڑکے بھیرے درزی کے ساتھ اس کی شادی کر دی —— گلاں اور نیفاں میں بس اتنا ہی فرق تھا جتنا ایک پھول اور کلی میں ہوتا ہے۔ اور جیرا پچیس سال کا جوان گبرو، ایک ابلتا دریا۔۔۔ کلی سے

سنبھالا نہیں گیا۔ نیفاں کا کوئی بھی ہتھیار جیرے کو زخمی نہیں کر سکا۔ شادی کے بعد جیرا سسرال میں آنے جانے لگا۔ اور گلاں ..... نیفاں کی پتنگ کاٹنے کے لئے اپنی ڈور پر مانجھا چڑھانے لگی۔ اور ایک دن ..... آسمان کی وسعتوں کو چھانتی ہوئی نائلون کی انگیا نے نیفاں کی پتنگ کو ایسی ٹھنگی ماری جب لوٹ پوٹ ہو کر سیدھی گلاں کے قدموں پر آ گری۔ لونگ کے لشکارے سے جیرے کے سارے شریر میں شرارے سے ناچنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پیاس کے جگنو جھلملا اٹھے۔ بس پھر وہ جھلملاتے جگنو گلاں نے بجھنے نہیں دیئے ---- یوں اُلٹا دریا... سارے کا سارا گلاں نے ہضم کر لیا۔ نیفاں بیچاری کو ایک بوند پانی بھی پینے کو نہیں ملا ---- کہتے ہیں کہ عورت کے لئے دن لوہے کا چھلا ہوتا ہے اور رات سونے کا جھومر لیکن نیفاں کے گھونسلے پر قبضہ جمانے کے بعد گلاں کے لئے دن بھی سونے کی جھانجر تھا اور رات بھی ---- جیرا اس کے لئے ساون کی میٹھی پھوار بن گیا، اور وہ رم جھم پھوار میں غسل کرنے لگی ---- وہ دونوں گلو کے واڑے اور شیتلا مندر میں جا کے بیر کھاتے۔ توی اور نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے۔ باہو، مرالیاں، سردیں سر اور ناگ بنی کی ہواؤں میں لہراتے اور کبھی کبھار دل پر جمی گناہ کی گرد کا احساس جاگنے پر وہ پیر بابا کی درگاہ پر جا کر چراغ جلاتے اور جھاڑو دیتے تاکہ گرد صاف ہو جائے ----

نیفاں کی اماں حمیداں جیرے کو گلاں کے پھولوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر بڑا تڑپی۔ وہ ادھرنگ کی ماری نیفاں کو گلاں کی چارپائی کے نیچے تڑپتے دیکھ کے خود پلنگ سے ایسی گری کہ اس کی زبان ہمیشہ کے لئے تالو کے ساتھ جا لگی ---- جاجی نے جیرے کو گلاں کی چادر سے باہر نکالنے کے لئے بہت زور لگایا۔ اس نے جیرے کو پیار سے سمجھایا۔ غصے سے ڈانٹا۔ مارا پیٹا، لیکن جیرا ایک ضدی بالک ... پھول ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ تھک ہار کر جاجی نے جیرے سے کہہ دیا کہ وہ نیفاں کو طلاق دے دے۔ جیرا ... تیار ہو گیا لیکن گلاں نے جیرے کو طلاق دینے نہیں دیا ----

جاجی کے لئے ساری کائنات بے جان ہو گئی۔ وہ نیفاں کی آنکھوں میں چُپ کی زردی دیکھ کر جاگرن کی سولی چڑھتا رہا۔ وہ نیفاں کو دور سے ہی اندر کا پیاسا مرتے ہوئے دیکھتا رہتا ---- اس نے

نیفاں کے ریگستان میں ہریالی لانے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے حلف لیا کہ وہ کلی مسلنے والوں کو برباد کر دے گا۔ اُس نے اپنے اندر رُکے ہوئے لاوے کا ڈھکنا اُٹھایا اور آنکھوں میں انگارے لا کر گلاں کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔ پر گلاں کے سامنے جلتی آگ کا کوئی بس نہیں چلا۔ اُس کی مسکان جاجی کے سارے جسم کو ٹھنڈا کر گئی۔ آنکھوں کے انگارے بُجھ گئے اور دِل کا درد آنسو میں ڈھل گیا۔ اُس کا روم روم نیفاں کے سُکھ کی بھیک مانگنے لگا۔

"میرے جُرم کی سزا نیفاں کو نہ دو۔ اُس پر رحم کرو۔ وہ تمہاری بھی تو بیٹی ہے اور بیٹی کا گھر ماں اُجاڑتی نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔ بخش دو۔ جیرے کو آزاد کر دو۔"

جاجی کو دھتورا کھاتے دیکھ کر گلاں بہت خوش ہوئی۔ وہ کھِلکھِلا کر ہنسنے لگی۔ اُس کی ہنسی سے جامی ترکھان کا مکان، مکان کے اندر لگا جامن کا پیڑ، پیڑ پر بیٹھے پنچھی ..... کانپ اُٹھے جولاہوں کی بستی میں بجلی ایک بار پھر کوندی۔ پر اب کے مکان نہیں گرے۔ کوئی جھونپڑی برا کی زد میں نہیں آئی۔ صرف گرجتی بجلی کی چمک میں جاجی کے وجود سے دھواں اُٹھتے سب نے دیکھا ——

مجاہد

دن بھر کی ہڑتال، مظاہرے اور ہنگامے دیکھ کر شام کو جب میں گھر پہونچا تو ذاکر کی امّی نے کھانا پروسا۔ میں کھانا کھانے ہی لگا تھا کہ ہمارے ہمسایے میں ایک خستہ جھونپڑی سے ایک عورت کی چیخیں سُنائی دینے لگیں۔ میں کھانا چھوڑ کر دوڑا ـــــ

گُلے کی ماں زار و قطار رو رہی تھی ـــ "او میرے بیٹے! تُو کہاں چلا گیا۔ ہائے میرے گُلے ..... تمہیں کس ظالم نے مارا۔ اگر مجھے وہ کُتّا مِل جائے ..... میں اُس کی بُوٹی بُوٹی نوچ لوُں ..... پر اپنے گُلے کو کہاں سے لاؤں۔ ہائے میرے گُلے ......"

"بہن چُپ کر۔ حوصلہ رکھ۔ گُلے کو کچھ نہیں ہوا۔ مریں اُس کے دشمن۔ اُس کی چھاتی میں تھوڑا سا زخم آیا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ کہ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ گُلا بچ جائے گا۔ تم یونہی جی ہلکان کرتی ہو" ماسی سرداراں گُلے کی ماں کو تسلّی دینے لگی۔

"تم لوگ مجھے کیوں جھوٹی تسلیاں دیتے ہو۔ بھلا جس کی چھاتی میں گولی لگی ہو، وہ کبھی بچ سکتا

ہے۔ ہائے میرے لعل۔ میرے دل کے ٹکڑے ......"

"یارب سچے! گلے کو بچالے۔ ہاجرہ کے بوڑھاپے کا یہی ایک سہارا ہے۔ جوانی کے شگوفوں کو دُور پھینک کر بیت جھڑ کی حدود میں داخل ہو رہی دو بہنوں کی عزت کا رکھوالا۔ اُن کے ہاتھ پیلے کرنے کا ذمہ دار۔ اگر گلے کو کچھ ہو گیا تو ہاجرہ کے ساتھ ساتھ اُس کی دونوں لڑکیوں کو بھی لوگوں کے برتن صاف کر کے اپنا پیٹ زکوات یا خیرات سے پالنا پڑے گا۔ یا پھر اپنی عزت نیلام کرنی ہو گی۔" قادر چاچے نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی۔

"ایک تو یہاں کا بابا آدم ہی نرالا ہے۔ ہر طرف گورکھ دھندا چلتا ہے۔ کیا بیوپار اور کیا سیاست۔ بھائی! ہم نے تو اپنا ضمیر بیچ دیا ہے۔ رات کو ایک بات کرتے ہیں۔ اور صبح دوسری۔ شام کو کسی چنار کو سلام کرتے ہیں اور صبح کسی برگد کا دم بھرتے ہیں۔ ہمارے لیڈروں کا یہ چلن .... اُن کے لئے تو منافع بخش ہے لیکن ہمیں یہ کب تک مداری کی طرح نچاتے رہیں گے۔ —— بھیّا! مختصر اً چار اطلاق ایک ایسی سوئی ہے جس کے سوراخ میں سے ہاتھی تو بہ آسانی نکل جاتا ہے مگر دُم اکثر پھنس جاتی ہے۔ پھر یہ دُم اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ چاروں طرف جلسے، جلوس، مظاہرے، ہڑتالیں اور ہنگامے ہونے لگتے ہیں۔ پر گلا تو کبھی ایسے جلسے جلوسوں میں نہیں گیا۔ وہ بچارا تو ہر روز صبح سیدھا گھر سے ریشم فیکٹری اور وہاں سے شام کو واپس گھر آتا تھا۔ لیکن آج اُسے کیا ہو گیا۔ وہ جلوس میں کیسے پھنس گیا۔" ریٹائرڈ ماسٹر غلام غوث قادر چاچا سے مخاطب تھا۔

"ہائے! بڑی آس اُمیدوں سے پالا تھا۔ بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ ہائے ...... میری آنکھوں کا نور چلا گیا۔ میرا لعل ظالموں نے چھین لیا۔ میرے گلے، آ میں تجھے گلے سے لگاؤں۔" ہاجرہ بین کر رہی تھی ——

"موسی! سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو چلتے پھرتے انسان کی روح قبض کرے، اور اگر اُس کا فضل ہو تو گولیوں سے چھلنی شخص بھی بچ جاتا ہے۔ وہ بڑا کارساز ہے موسی —— اور گلا..... وہ تو مجاہد ہے۔ اُس نے اللہ کے بنائے ہوئے دین کی عظمت کے لئے اپنی چھاتی پر گولی کھائی ہے

وہ اپنے پاک نبیؐ کی بے حرمتی کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ وہ سچا مسلمان ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولِ پاک کے حکم کی پابندی کرے۔ اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے جہاد کرے اور جو اللہ کے رستے میں جہاد کرتے ہیں اُن کا خدا نگہبان ہوتا ہے۔ تم بے فکر رہو موسیٰ! وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بیڑا غرق ہو اُن کا..... جنہوں نے ہمیں ان بھیڑیوں کے سپرد کر دیا۔ اِن نامرادوں نے تو ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔" مولوی فضل دین غازیوں کے کارنامے سُناتا سُناتا کہنے لگا۔

—— میں چُپ چاپ کھڑا سب باتیں سُنتا رہا۔ پھر مسکراتا ہوا ہسپتال کی جانب چل پڑا۔ گُلّا وارڈ نمبر دو، کے چھبیس نمبر بستر پہ نیم مردہ پڑا تھا۔ گولی اُس کی چھاتی سے نکال لی گئی تھی۔ اُسے خون دیا جا رہا تھا —— اِس وارڈ میں اور بھی بہت سے زخمی تھے جو آج کی پولیس فائرنگ اور لاٹھی چارج سے زخمی ہوئے تھے —— زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں.... ہسپتال میں.... پہلے بھی گونجا کرتی تھیں —— سن اکتیس (۳۱) میں،...... ۴۶ میں، ۴۷ میں، ۵۳ میں، ۶۴ میں، ۶۵ میں، ۷۱ میں،..... زخم ہی زخم.... خون ہی خون..... موت ہی موت —— نعرے کب سے لگائے جاتے رہے ہیں۔ ڈوگرہ شاہی مردہ باد..... کشمیر چھوڑ دو..... قبائلی حملہ مردہ باد..... ہمارا الحاق مکمل ہے.. الحاق عارضی ہے..... یہ ملک ہمارا ہے، اِس کا فیصلہ ہم کریں گے۔ رائے شماری فوراً کرو۔ ..... پاکستان زندہ باد..... انڈین ڈاگز گو بیک..... اصلی مجرم کو پیش کرو..... سازش کو ننگا کرو —— اور نعرے آج بھی لگائے جا رہے ہیں..... پاکستان مردہ باد، شہید بھٹو زندہ باد..... آزاد کشمیر واپس لو۔ ہندوستان زندہ باد ——

"ڈاکٹر صاحب! قبر کا عذاب برداشت کر لوں گا مگر اِس درد کا عذاب برداشت نہیں ہوتا مجھے بے ہوش کر دو۔" —— اور ڈاکٹر گُلے کا معائنہ کر رہا ہے ——

"سارے شہر میں صبح سے ہی چھوٹے چھوٹے جلوس نکلنے شروع ہو گئے تھے، جو

لال چوک میں جمع ہوتے گئے۔ وہاں سے ایک بڑا جلوس نکلا۔ جلوس کیا تھا... انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ــــ نعرے گونج رہے تھے ... "اسلام زندہ باد۔ نعرۂ تکبیر... اللہ اکبر، نعرۂ رسالت... یا رسول اللہ، اک نعرۂ پنجتن... اک نعرۂ حیدری ... یا علی۔ پاکستان... نہیں نہیں، آج یہ نعرہ کسی نے نہیں لگایا۔ بھلا نہیں کیا۔ پاکستان ہو یا بنگلہ دیش۔ برما ہو یا لنکا۔ ایران ہو یا افغانستان، امریکہ ہو یا روس، چین ہو یا جاپان.... جلوس ہر جگہ نکلتے ہیں۔ مظاہرے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ گولیاں ہر دیش میں چلتی ہیں۔ اب تو کوڑے لگانے، ہاتھ اور ٹانگیں کاٹنے اور پھانسی دینے کا رواج بھی عام ہو چکا ہے ــ انسان کا لہو ہر ملک میں بہتا ہے۔ قربانی ہر جگہ دی جاتی ہے ــــ ہاں! تو میں بتا رہا تھا کہ نعرے لگ رہے تھے ... اور گلا، ایک مجاہد.... جلوس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس کا چہرہ شعلہ بنا ہوا تھا۔ اُس کی چال غازیوں ایسی تھی۔ واہ واہ.... کیا جلال تھا ــــ نعروں کے جوش سے جب غازیوں کا لہو اُبلنے لگا تو پھر... پتھر چلنے شروع ہو گئے۔ مار دھاڑ پھونک اور توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ سرکار کی پولیس ــ لاٹھیوں، ٹیئر گیس اور بندوقوں سے لیس... حرکت میں آ گئی۔ آپس میں مقابلہ ہونے لگا۔ گولیوں کا مقابلہ پتھروں سے۔ پتھر برستے رہے۔ گولیاں چلتی رہیں۔ نعرے گونجتے رہے۔ ــ پتھر.... لاٹھیاں.... آگ.... دھواں.... بندوقیں.... اور ایک گولی گلّے کی چھاتی میں جذب ہو گئی ــ گلّا ایک سچا مومن ہے۔ وہ ایک مجاہد ہے اور مجاہد موت سے نہیں ڈرتے۔ گلّے نے ایک عظیم قربانی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور اُس کی حفاظت کرے گا ــــ" ناکر یکا بولتا رہا۔

ــــ گلّا ہوش میں آ گیا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک ڈاکٹر، ایک نرس، اکر یکا اور میں.... باقی بستروں پر لیٹے ہوئے زخمیوں کی آوازیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میری ماں کہاں ہے۔ میری بہنوں کو بلاؤ۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ اب میری بہنوں کی شادی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اب شاید ہماری کچی جھونپڑی پر گھاس کی جگہ ٹین کی چھت ہوگی" گلّا کہہ رہا تھا۔

"ہاں گلّے! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ۔"

"نہیں ڈاکٹر، نہیں! اگر میں اچھا ہو گیا تو کچھ نہیں ہوگا۔ میرا مرنا ضروری ہے۔"

"پر کیوں گلّے؟ تم تو مجاہد ہو۔ قوم کو تمہارے ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو مذہب کے لئے ....."

"وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! پر آپ مجھے بتائیں کہ میری موت کے بعد سرکار میری ماں کو پیسے دے گی نا۔"

"پیسے؟ کیسے پیسے؟"

"ڈاکٹر صاحب! کیا ایسے جلوسوں میں ہلاک ہونے والوں کے وارثوں کو سرکار کی طرف سے پیسے نہیں ملتے؟ ابھی پچھلے سال کے مظاہروں میں ہلاک ہونے والوں کے وارثوں کو سرکار نے دس دس ہزار روپے نقد دیئے تھے....."

یہ سنتے ہی ڈاکٹر ایک دم چونک پڑا۔ مجھے لگا جیسے اُسے سارے ہسپتال میں نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہو ــــ "نعرۂ تکبیر، ہر ہر مہادیو، بولے سو نہال ....." ــــ اور میں سوچنے لگا.... یہ جلسے، جلوس، مظاہرے، ہڑتالیں، یہ پتھر، بندوقیں، یہ آگ کی وارداتیں.. یہ خون ہی خون، ہسپتال میں بھی خریدا جاتا ہے۔ لہو کی ایک بوتل چالیس روپے میں۔ یہ سارے شریر کا..... بھوک مٹانے کے لئے، ایسے بھی مر سکتا ہے؟..... اور میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ..... ایک پتھر کا بت، گلّے کو دیکھے جا رہا تھا۔ گلّے کی سوالی نظریں پتھر سے ٹکراتی رہیں۔ پتھر چوڑا ہوتا گیا۔ پتھر پھیل گیا ــــ پتھر آکاش بن گیا...... اور گلّے کی نظریں آکاش کی دھند میں ریزہ ریزہ ہو گئیں ـــ

انقلاب

آج تیس سالوں کے بعد میں پھر اُسی تاریخی شہر میں آیا ہوں جہاں سب سے پہلے میرے ساتھیوں نے آزادی کی جوت جلائی تھی۔ میں اُسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں جو آج بھی اتنا ہی مشہور ہے جتنا اُن دِنوں تھا ــــ سامان کمرے میں رکھنے کے بعد میں گھومنے پھرنے کے مقصد سے بازار کی جانب چل پڑا ــــ بڑی تبدیلی آئی ہوئی ہے۔

کچے پکے مکانوں کی جگہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں پختہ اور چوڑی سڑکوں پر رنگ برنگی کاریں..... جیسے باغ میں تتلیاں اُڑ رہی ہوں ــــ بڑی رونق ہے۔ لال چوک پہنچتے ہی مجھے ایک پُرانی بات یاد آگئی..... ہاں! یہاں سامنے والی پٹڑی پر ایک چھابڑی والا آم بیچ رہا تھا۔ دو سپاہی آئے اور وہ دو سیر آم لے کر چل پڑے۔ چھابڑی والے نے جب پیسوں کے لیے آواز دی تو وہ خون آلود آنکھیں نکال کر دیکھنے لگے۔

"حرام زادے! تم کس کی اجازت سے اس پٹڑی پر بیٹھے ہو" ــــ وہ چار تھپڑ چھابڑی فروش

کو اور ایک آدھ لوٹ ..... چھابڑی کو۔ آم .... غریب کے سپنوں کی طرح بکھر گئے سپاہیوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور چل دیئے ـــــ اُن کے جانے کے بعد وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا ـــــ "بابو جی! آزادی ملنے والی ہے۔ پھر ہمارا اپنا راج ہو گا۔ پھر یہ ظلم نہیں ہوں گے"ـــــ اور آج اپنا راج ہے۔ لوگ آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں۔ بڑی چہل پہل ہے۔ ـــــ شہید چوک پہنچ کر میں اُس یادگار کو دیکھنے لگا جو عوام نے بنائی ہے۔ یادگار کے نیچے یہ حروف لکھے ہیں۔

"اُن غریبوں کی یادگار جو روٹی کپڑا اور مکان کی خاطر شہید ہوئے۔" پاس ہی پٹڑی پر بیٹھے ایک چھابڑی فروش سے میں نے ایک کلو سیب مانگے۔ وہ سیب تول ہی رہا تھا کہ ایک حوالدار اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا ـــــ "اوئے! آج تم پھر لائسنس کے بغیر پٹڑی پر بیٹھے ہو"ـــــ "حضور! مائی باپ! آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں بھلا کس بات کی پرواہ ہے"ـــــ اور اُس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر حوالدار کو دے دیا۔ "ٹھیک ہے، خبردار جو کل یہاں بیٹھے"ـــــ اور مجھے تیس سال پہلے کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں ـــــ "ہمیں آزادی ملنے والی ہے۔ پھر اپنا راج ہوگا۔ پھر یہ ظلم نہیں ہوں گے ......"

ہمراز

گہنوں سے لدی بنی سنوری دلہن کو گھونگھٹ میں دیکھتے ہی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اُس کے ہاتھ گھونگھٹ کی اور بڑھنے لگے ـــــ دوپٹہ سرکا۔ بادلوں میں سے چاند نکلا۔۔۔۔۔ اور مہندی لگے ہاتھوں میں چھپ گیا۔ کانچ کی چوڑیاں مسکرائیں۔ اُس کے مونہہ سے نکلا ـــــ "قدرت کے بلوری ہاتھوں سے تراشا ہوا انمول ہیرا۔ آکاش سے اُتری ہوئی اپسرا" ـــــ اور اُس کے جذبات مچل پڑے۔ سارا حسن اُس کی مضبوط باہوں میں سمٹ آیا۔ اُس کے ہونٹ ریتا کے ہونٹوں پر پیوست ہو گئے۔ بھنورا پھول کا رس چوسنے لگا۔ اُس کی خماری آنکھیں خواب دیکھنے لگیں ـــــ دھند اندھیرے میں کچھ سایے دکھائی دینے لگے۔ سایے نزدیک آنے لگے۔ نزدیک آتے گئے۔۔۔۔۔ اور اُس کی آنکھوں میں جذب ہو گئے۔ اُسے لگا جیسے اُس کی باہوں میں سرلو ہے۔۔۔۔۔ تریپت ہے۔۔۔۔۔ تسلیم ہے ـــــ

پھر آنکھوں کی خماری اُتری۔ دِل کی دھڑکن مدھم ہوئی۔ بازوؤں کی پکڑ ڈھیلی پڑ گئی۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ وہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"تم تو رو پا ہو، میری پتنی۔" ـــــ وہ مسکرایا...... اور پھر روپا سے بولا۔

"روپا! تم سے ایک بات پوچھوں۔"

"ہاں پوچھئے۔"

ابھی جب ہم جذبات کے گہرے ساگر میں غوطے کھا رہے تھے۔ تو...... تو تمہیں اُس وقت... اپنے...... کس دوست کی یاد آئی تھی؟"

ـــــ بات سُنتے ہی گلاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کانچ کی چوڑیاں میں ایک شور اُٹھا ـــــ اور...... ایک چوڑی ٹوٹ کر فرش پر جا پڑی ـــــ

پانی کی لکیریں

سرحدی حفاظتی پولیس کے حوالدار کرنیل سنگھ نے اپنے چوکی افسر انسپکٹر رندھاوا کو سلوٹ مارا اور کہا۔

"صاحب! دو پاکستانی جاسوس سرحد پار کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ واپس پاکستان جا رہے تھے کہ ہمارے نوجوانوں نے پکڑ لیا۔"

"جامہ تلاشی لی؟" انسپکٹر نے وردی پہنتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! ایک کی جیب سے دو روپیہ والا پاکستانی نوٹ اور دوسرے کی جیب سے ہماری کرنسی کے ایک ایک روپیہ والے چار نوٹ ملے۔ اور کچھ نہیں ملا صاحب!"

"اور کچھ نہیں ملا.....؟" انسپکٹر نے بڑی حیرانگی سے پوچھا۔

"نہیں صاحب! لیکن ایک کی جیب سے مونگ پھلی کے دانے اور دوسرے سے

ریوڑیاں ملی تھیں۔ دونوں مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھاتے ہوئے اور فلم 'بوبی' کا گیت..... "ہم تم اک کمرے میں بند ہو جائیں اور بوبی آجائے"۔۔۔ گاتے گاتے سرحد پار کر رہے تھے کہ رنجیتے' گوشنے اور ڈیوڈ نے دونوں کو جا پکڑا۔ بہت پھڑ پھڑائے..... لیکن ہم نے پھڑکنے نہیں دیا۔ کہتے ہیں کہ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ بھلا.... یہاں بیساکھی کے میلے میں اُن کی کون سی اماں ناچ رہی تھی جس سے ملنے آگئے میلے ..... کہیں کے۔"

"چلو بھئی کرنیل سنگھ! دکھاؤ تو بھلا' کون سے جاسوس پکڑے ہیں آپ لوگوں نے۔" اُس نے اپنے خیمے سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور دونوں چوکی کی جانب چل پڑے۔

"ستو والی" کی اِس چوکی پر انسپکٹر رندھاوا کو آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے یہی کوئی چار مہینے ہوئے ہوں گے۔ ملک کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کے جذبے نے اسے تعلیم مکمل نہیں کرنے دی۔ اُسے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت لڑائی میں امرجنسی کمیشن مل گیا۔ اور پھر اُسے جنگ کے کسی اگلے مورچے پر بھیج دیا گیا۔ جہاں اُس کے جذبے کی گرمی نے اُس کی بڑی مدد کی۔ اور اُس نے دلیری کے کئی کارنامے انجام دیئے۔ جنگ ختم ہوتے ہی رندھاوا کو بھی دوسرے عارضی بھرتی کئے گئے فوجیوں کی طرح فوج سے نکال دیا گیا۔ لیکن اُس کے دیر چکر نے اُسے کئی چکر کرانے کے بعد بارڈر سیکورٹی فورس میں انسپکٹر بنا دیا۔ ان چکروں نے رندھاوا کے سارے جذبات ٹھنڈے کر دیئے تھے۔ اور اب اُسے اچھے برے کی پہچان ہو گئی تھی۔ اُس نے بھارت ماتا کے اصل دشمن اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔

اُس نے دونوں جاسوسوں کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا۔ بارہ' یارہ' تیرہ' تیرہ سال کے کمسن لڑکے' گورے چٹے چہرے' چانٹے پڑنے سے اور بھی سرخ ہو گئے تھے۔ آنکھیں سوجھی ہوئیں۔ چہرے پر انگلیوں کے نشان۔ دونوں سہمے ہوئے ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیوں بھئی لڑکو! تم کہاں سے آئے ہو۔" انسپکٹر رندھاوا نے ذرا رعب سے پوچھا۔

"ہم جناب کھلیال سے آئے ہیں۔"

"کجلیاں تو پاکستان میں ہے، تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

"پتنگ لوٹنے ۔"

"پتنگ لوٹنے؟"

"جی ہاں!"

"تو لوٹی پھر تم نے پتنگ؟" انسپکٹر رندھاوا نے جرح کی۔

"نہیں جی!"

"کیوں؟"

"پتنگ ہمارے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ آم کے پیڑ کی ٹہنی سے جا اٹکی۔"

"پھر تم لوگ واپس کیوں نہیں لوٹ گئے۔ یہاں کیا کرتے رہے؟"

"صاحب یہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں۔ بکواس کر رہے ہیں۔ انہوں نے پہلے یہ بیان دیا کہ یہ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ صاحب یہ پکے جاسوس ہیں۔ ایسے کئی لڑکوں کو دشمن نے جاسوسی کی تربیت دے کر ہمارے ملک میں بھیجا ہے تاکہ ہم پر ایک اور حملہ کی تیاری کی جاسکے۔ یہ دشمن کی نئی چال ہے۔" حوالدار کرنیل سنگھ نے انسپکٹر رندھاوا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میرا نام محمد طفیل ہے۔" نکر پہنے ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔

"میرا پورا نام عبدالعزیز باجوا ہے۔ لیکن مجھے سبھی جیجی کہتے ہیں۔" پتلون پہنے ہوئے نے جواب دیا۔

"تم دونوں کی عمر کیا ہے؟"

"میری عمر تیرہ سال ہے۔" طفیل نے جواب دیا۔

"ماں کہتی ہے کہ میں نے چودھویں سال میں پاؤں رکھا ہے۔ عزیز نے کہا۔

"تم آپس میں کیا لگتے ہو۔"

"جی! ہم دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔"

"رہتے کہاں ہو اور کیا کام کرتے ہو؟"

"میں گورنمنٹ ہائی سکول ڈالہ والی میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں، اور ہم رہتے بھی وہیں ہیں۔" طفیل نے جواب دیا۔

میں بھی ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ اور اس سامنے والے گاؤں کملیاں میں رہتا ہوں۔ آج کل ہماری چھٹیاں ہیں۔ اِسی لئے طفیل ہمیں ملنے آیا ہوا تھا۔"

"اچھا تو اب سچ سچ بتاؤ کہ تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟ دیکھو! اگر تم لوگوں نے سچ بتایا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ورنہ تمہاری چمڑی اُدھیڑ کر اس میں بھوسہ بھر دیں گے اور تمہارا گوشت چیلوں اور کوؤں کو کھلا دیں گے۔ سچ بتاؤ کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے۔ تمہارے سپرد کیا کام کیا گیا تھا؟ یہاں تم کن کے پاس رہے ہو؟ تمہارے کتنے آدمی یہاں کام کر رہے ہیں؟" انسپکٹر زندھاوا نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔ اُس کی آنکھیں دونوں لڑکوں کے چہروں پر مرکوز تھیں ۔۔ سپاٹ چہرے۔ وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور کبھی انسپکٹر کی طرف۔

"جناب! ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔" جیجی نے روتے ہوئے کہا۔

"خدا پاک کی قسم! ہم یہاں پتنگ لوٹنے ہی آتے تھے بات یوں ہوئی کہ ہم دونوں چھت پر پتنگ اُڑا رہے تھے۔ ایک کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھتے ہی میں نے اپنی پتنگ کی ڈور چھوٹے بھائی شریفے کو دی اور خود پتنگ لوٹنے دوڑ پڑا۔ میرے پیچھے پیچھے طفیل بھی دوڑا اور ہم دونوں "بو کاٹے" کہتے کہتے آپ کے گاؤں تک پہونچ گئے۔ دُور ہی کتنا ہے۔ بس گنتی کے یہ دو چار کھیت ہی تو پھلانگنے پڑتے ہیں۔" جیجی نے ہاتھ سے راستہ ناپتے ہوئے کہا۔

"جب تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ ہمارا گاؤں ہے تو تم لوگ واپس کیوں نہیں لوٹ گئے؟"

حوالدار کرنیل سنگھ نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ اس کی خوفناک صورت دیکھتے ہی طفیل بول پڑا

"نہیں جی! یہ سامنے کے گاؤں سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی تھی۔ ڈھول کی آواز سن کر ہم سے رہا نہیں گیا۔ ہم دونوں تماشہ دیکھنے وہاں چلے گئے۔ وہاں جناب! ایک ڈھولیا ڈھول بجا رہا تھا۔ اور لوگ بھنگڑہ ناچ رہے تھے۔ بہت ہی شور و غل تھا۔ کچھ لوگ دارو پی کر آوازے کس رہے تھے۔ ڈھول کی تال پر ہم دونوں بھی ناچ پڑے، ایک بوڑھا ناچتے ناچتے میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور پھر ہم سبھی ناچتے گاتے، نواں شہر پہونچے۔ میں اور جمی بھی۔ وہاں جب وہ ایک بس پر سوار ہونے لگے تو ہمیں پتہ چلا کہ وہ جموں جا رہے تھے۔ نہر پر بیساکھی کا میلہ دیکھنے۔ جمی نے بھی مجھے میلہ دیکھنے کے لئے کہا۔

"جناب یہ تو ماننا ہی نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے اس سے کہا کہ ہم شام تک واپس لوٹ آئیں گے تب اس نے بھی حامی بھری" عزیز نے طفیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرے ابّا اکثر کہا کرتے ہیں کہ جموں ۔۔۔۔ نہر پر بیساکھی کا ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اور وہ دو آنے کرایہ خرچ کرکے ایک گھنٹے میں نہر پہونچ جایا کرتے تھے۔ سارا دن میلہ کی رونق دیکھ کر شام کو واپس گھر لوٹ آتے ـــــ ہم بھی ایک بس میں بیٹھ گئے ـــــ اور جناب! ہم نے وہاں بیساکھی کا میلہ دیکھا۔ جی بھر کے بھنگڑہ ڈالا۔ گنّے چوسے، قلفی کھائی، میلہ دیکھنے کے بعد ہم نے ایک فلم بھی دیکھی"۔

"ہاں جی! جھوٹ بولے کوّا کاٹے، کالے کوے سے ڈریو"۔ طفیل جھٹ سے بیچ میں بول پڑا۔

"چپ کر، طفیل! یہ مونچھوں والا "ظ" ظالم پھر مارے گا"۔ عزیز نے طفیل کے چٹکی بھرتے ہوئے کانا پھوسی کی۔ اردو قاعدہ میں "ظ" کے خانے میں ہے نا! بالکل اسی سردار کی تصویر

"ہاں ہاں! بالکل اسی کی تصویر ہے۔ جبھی تو اس ظالم نے ہمیں مارا"۔ طفیل نے کرنیل سنگھ کو دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔

"لیکن جموں جانے کے لئے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟" انسپکٹر رندھاوا نے تفتیش

جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جیجی کے پاس تو کوئی پیسہ نہیں تھا۔ پر میرے پاس دو روپے کا اپنا ایک نوٹ تھا۔ نواں شہر پہونچ کر میں جموں کی ٹکٹ لینے کے لئے وہ نوٹ ٹکٹ کلرک کو دینے ہی لگا تھا کہ جیجی نے روک دیا اور کہا کہ یہاں پاکستانی نوٹ نہیں چلتے۔ میرے ابا نے حج سے میرے لئے ایک گھڑی لائی تھی۔ ہم نے وہ گھڑی وہاں ایک گھڑی ساز کو تیس روپے میں فروخت کی۔ تب ہم جا کر ہم جموں پہنچے۔ ہم نے وہاں میلہ دیکھا فلم دیکھی اور پھر بس میں ہی بیٹھ کر واپس نواں شہر پہونچ گئے اور اسی راستہ سے واپس اپنے گاؤں کو جا رہے تھے کہ ان ظالموں نے ہمیں پکڑ لیا اور بہت پیٹا۔" طفیل نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور رونے لگا۔

"انہوں نے ہمیں چھوٹا دیکھ کر مارا ہے۔ اگر میرے ابا کو پتہ چل جائے تو وہ ان کے ٹکڑے کر دے۔ بڑے پہلوان بنے پھرتے ہیں۔" عزیز نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تیرے ابے کو کھائیں سؤر۔ حرامی۔ اپنے کا رعب دکھاتے ہو۔ تیرے ابا کی ماں کی...... صاحب! یہ کتے جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں کا بالکل یقین نہ کریں۔ گورو مہاراج نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسلا، تیل والا بازو تلوں کی بوری میں ڈال دے اور پھر اتنی ہی قسمیں کھائے کہ جتنے تل اس کے بازو پر لگے ہوں۔ تب بھی اس کی بات کا یقین نہ کرو۔ صاحب! یہ پکے جاسوس ہیں انہیں ہیڈ کوارٹر بھیجنا چاہیئے۔ خود انٹروگیشن سنٹر والے سب کچھ اگلوا لیں گے۔" حوالدار کرنیل سنگھ انسپکٹر مدھاوا کو مشورہ دے رہا تھا۔

انسپکٹر نے دونوں لڑکوں کو چپ کرایا اور کرنیل سنگھ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کس گورو صاحب نے، یہ تلوں والی بات کہی تھی۔؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا صاحب۔ پر یہ بات ہے بالکل سچ۔ ہمیں گرنتھی جی نے بتائی تھی۔ اور وہ کوئی جھوٹ تھوڑی بولیں گے۔"

ایسی غلط باتیں پھیلاتے ہوئے تم لوگوں کو شرم آنی چاہیئے۔" انسپکٹر رندھاوا نے کرنیل سنگھ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اور جیپ منگوانے کا حکم دیا۔ وہ یہ کیس ہیڈ کوارٹر بھیجنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

—— جیپ تو ان شہر کی طرف دوڑ رہی تھی اور ..... عزیز اور طفیل کی نظریں اپنے گاؤں کی طرف —— ہموار راستہ —— لیکن کتنا پُر پیچ —— ہمالہ سے بھی مشکل —— نظریں دیکھتی رہیں۔ فاصلہ بڑھتا گیا —— اور جیپ لکشمی واچ ہاؤس کے سامنے رک گئی۔

"ان لڑکوں نے تمہیں کوئی گھڑی فروخت کی ہے ؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں سردار صاحب! میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔"

"سچ سچ بتاؤ۔ ورنہ میں ابھی تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔" انسپکٹر گرجا —— طفیل کی شناخت پر انسپکٹر نے گھڑی برآمد کر لی اور جیپ واپس چوکی کی طرف چل پڑی۔

"کیوں بھئی کرنیل سنگھ! اب ان لڑکوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔" انسپکٹر رندھاوا نے دونوں لڑکوں کو اپنے خیمے کی طرف لے جاتے ہوئے کرنیل سنگھ سے پوچھا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں صاحب۔"

—— "کیوں بھئی لڑکو! تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے۔ یا نہیں ؟" انسپکٹر نے طفیل کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے پوچھا۔

جی نہیں! لیکن ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو بتاؤ، کیا کھاؤ گے ؟"

"جی! کچھ نہیں۔"

"بھئی! تمہیں تو سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ پھر انکار کیوں ؟"

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر طفیل ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"ابّا کہا کرتے ہیں کہ اگر کافر کے ہاتھوں کچھ کھاؤ تو گناہ ہوتا ہے۔"

"لیکن بیٹا! کیا میں تمہیں کافر لگتا ہوں؟ میرے بھی تمہاری ہی طرح ہاتھ، پاؤں، ناک منہ ہے اور پھر میں بھی تو اسی خدا کے آگے سر جھکاتا ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ بیٹا ہم سبھی انسان ہیں۔ تمہارے ابّا جان کو کسی نے غلط بتایا ہے۔" انسپکٹر نے طفیل کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے سمجھایا۔

"سچ"؟—

"بالکل سچ۔"

"پھر تو ہم جی بھر کر کھائیں گے۔ ہمیں بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔" عزیز نے اچھلتے ہوئے کہا—

کھانا کھانے کے بعد انسپکٹر رندھاوا نے ڈیوٹی پر کھڑے دو سپاہیوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا!

"دیکھو بھئی! اِن دونوں لڑکوں کو سرحد پار کرادو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ ان کے سپاہی گشت پر نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تو انہیں چھوڑ دیں اور وہ پکڑ لیں—"

سپاہیوں نے سلوٹ مارا اور دونوں لڑکوں کو لے گئے— انسپکٹر اُنہیں دور تک جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا...... اُس کا چہرہ پھول کی طرح کِھل اٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں لیکن اُس کے کانوں میں کچھ ہلکی ہلکی سی آوازیں پڑ رہی تھیں....

"انسپکٹر نے اِن سانپ کے بچوں کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب اِس کی خیر نہیں۔ کل تک خود اسے معلوم ہو جائے گا۔"

آوازیں اُبھرتی رہیں —— اور انسپکٹر چپ چاپ اپنے خیمے میں چلا گیا—

گھاس پر چلنا منع ہے

میرا نام رالو ہے۔ میں اِس اُجاڑ باغ کی مالن تھی۔ میں نے اِس باغ کو سنوارنے اور شنگھارنے میں کبھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی وقت یہ باغ اپنی خوبصورتی کے لئے دور دور تک مشہور تھا۔ میں نے اِس باغ کی ہری گھاس پر چلنے والوں کو کبھی نہیں روکا، کیونکہ صبح کے وقت شبنم سے نہائی ہوئی مخملی گھاس پر ننگے پاؤں چلنا صحت کے لیئے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ننگا جسم تازہ گھاس پر رینگنے لگے تو اُس میں ایک انوکھا سرور ہے۔ ایک انوکھی لذت ہے۔ کم سے کم میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔ خیر یہ پرانی باتیں ہیں۔ ماضی کی یادیں ہیں۔ لیکن یادوں کو کبھی کبھی تازہ کر لیا جائے تو برا کیا ہے۔

میرے باغ کے باہر ایک گل مہر کا درخت لگا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ ہمیشہ کے لئے میرے باغ کے اندر آجائے اور اس کی خوبصورتی کو بڑھائے۔ مگر گل مہر کی جڑیں، رسموں اور رواجوں کی کالی مٹی سے بھری دھرتی میں بہت اندر تک دھنسی

ہوئی تھیں۔ میرے لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ اُس کالی مٹی میں سے اکھڑ نہیں سکا اور میرے باغ کی رونق نہیں بن سکا۔ پر کبھی کبھار ہوا کے کسی تیز جھونکے کے ساتھ وہ میرے باغ کے اندر ضرور جھانک لیتا۔ آج اُس گُل مہر کا وجود مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا خبر زندگی کے اس صحرا میں آج وہ ٹھوکریں کھا رہا ہوگا یا اپنے لال لال پھولوں سے کسی بلوری شیشیوں والے گھر کو حسن بخش رہا ہوگا۔ اللہ جانے وہ ہرا بھی ہوگا یا میری طرح سیاہ بختی کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ سیاہ بختی میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا ــــ ہاں! میں بات تو اپنے باغ کی کر رہی ہوں لیکن اس باغ کے ساتھ گُل مہر کی بات بھی جُڑتی ہے۔ اور وہ یوں کہ جب میرے باغ کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں تو سب سے پہلے گُل مہر نے ہی مجھے میرے باغ کی سُندرتا کا احساس دلایا تھا۔ اُن دنوں وہ اکثر میرے باغ کی چار دیواری کے اندر جھانکتا رہتا۔ بڑی دلکش نظروں سے میرا کھِل رہا باغ لہرانے لگتا ــــ میرے باغ کی کنواری گھاس گُل مہر کو گلے لگانے کے لئے بے تاب رہنے لگی۔ میں اُس کے پھولوں کی خوشبو سونگھنے کے لئے ٹہلنے لگی۔ پانی آگ کے پاس رہے تو وہ کبھی نہ کبھی اُبلنے لگ جاتا ہے۔ آگ اور پانی کی اُس کشمکش میں آخر ایک دن وہ میرے باغ کے اندر آ گیا۔ اور میری شاداب مخملی گھاس پر رینگنے لگا۔ مجھے پہلی بار اُس کا گھاس پر رینگنا بہت اچھا لگا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ زندگی بھر میرے باغ کی گھاس پر رینگتا رہے اور ہمیشہ کے لئے اس کا مالک بن جائے۔ لیکن گُل مہر تو میرے باغ پر کچہ سکہ کی طرح صرف اڑھائی دن کا راج کرنا چاہتا تھا اور یہ بات مجھے منظور نہ تھی ــــ میں نے ایک ایسی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا جس کی زندگی کے چولہے میں سدا حسرتوں اور تمناؤں کی لکڑی ہی جلتی رہی۔ اُس کی حسرتوں کا کنکول بیچ بازار ٹوٹا تھا۔ اور پھر دھیرے دھیرے وہ بازار میں ٹوٹنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ایک ٹکسال بن گئی۔ ایک ایسی ٹکسال جس میں ڈھلا

ہوا ہر سکہ مختلف ہوتا۔ پھر ٹکسال سکے ڈھال ڈھال کر تھک گئی۔ وہ گھس گئی اور ختم ہو گئی
—— گل مہر مجھے ہمیشہ اس بات کا طعنہ دیتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بات کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے۔ خاص کر اس کی بات کا...... جسے کوئی اپنا سمجھے۔ پر یہاں تو اپنے ہی دھوکا دیتے ہیں۔ اپنے ہی تو باتیں کرتے ہیں۔ یہاں اپنی آنکھ کا شہتیر کسی کو دکھائی نہیں دیتا مگر دوسروں کے آنکھ کا تنکا سب کو دکھائی دیتا ہے —— میں بھی عیبوں کی قتل گاہ پر قربان کر دی گئی۔ میری روح اداس ہو گئی۔ میرا دل پریشان رہنے لگا۔ میں اکثر یہ گیت گنگناتی رہتی

گڈی کٹ جاندی جنہاں دی پریم والی
منڈے لے جاندے اوہناں دی ڈور لٹ کے

لیکن میں نے تو اپنے باغ کے حسن کی ڈور کو گل مہر کے ہاتھوں خود لٹایا تھا۔ میری زندگی میں وہ سب سے پہلا حادثہ تھا —— پر جو حادثہ ایک بار ہو جائے وہ چاہیے پھر سو بار دھرایا جائے ..... تو کوئی فرق نہیں پڑتا ——

گل مہر مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ جانے کہاں گم ہو گیا۔ اس کی گمشدگی کے بعد میں ناکنواری بن گئی جس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا شریان چھوا ہے ..... پاک، صاف اور مقدس ہے۔ پھر میرے چاند کو داغ لگتے رہے۔ میری چاندنی میلی ہوتی رہی —— اور میں رفتہ رفتہ کبھی لوجی کی طرح بے قابو ہو گئی۔ میں سڑک پر لگا ہوا ایک ایسا نلکہ بن گئی کہ جس کا جی کرتا پیاس بجھا لیتا۔ میں نے کبھی کسی کو نہیں روکا۔ پیاسے لوگ اپنی پیاس بجھاتے رہتے اور میں ان کی جیبیں ہلکی کرتی رہتی —— جیبیں ہلکی ہوتی رہیں ..... میرے باغ میں نکھار آتا گیا۔ رنگ برنگے پھولوں کی مہک میرے باغ کو مست بنانے لگی۔ کھلی ہواؤں کی مستی من پنچھی کو اڑنے کے لئے اکسانے لگی —— روشنیوں کی چمک —— میرے ذہن کا در کھٹکھٹانے لگی۔ میرے باغ کے سبزے میں میری پہلی سوچ میں گم ہو گئے

میں نئے زمانے کے رستوں پر چلنے لگی اور..... گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے لگی۔ میرے سامنے کئی قصبوں کی بستی ہوتی۔ کئی الھڑ دوشیزاؤں کی شوخی کھلی۔ شہروں کی بے پناہ بھیڑ میں میرے باغ کے پھول خوب کھلے۔ بڑی رونقیں رہتیں۔ دودے شاہ کے چوبے میری مرادیں برلاتے۔ کام دیوتے میرے باغ کا طواف کرتے ہیں نئے زمانے کے سبھی گر سیکھ گئی تھی۔ میرا کاروبار جوبن پر تھا میں دیوتاؤں کی بھوک مٹاتی۔ اُن کے جسموں کی آگ بجھاتی۔ کیونکہ اس دنیا میں جسموں کی آگ بجھانا شرافت اور ایمانداری کا عمل سمجھا جاتا تھا۔ میرے باغ کے اندر وہ جانور روز جگالی کرتے جنہیں ہیگانی کھرلی کا چارا میرے دار لگتا۔ روز کوئی مجھے ڈھونڈتا اور کبھی میں کسی کو۔ اسی طرح زندگی کے دن گزر رہے تھے ــــ میں خوش تھی۔ اس لئے کہ اس دنیا میں خوش رہنا اچھے اخلاق کا ثبوت تھا۔ میرے باغ میں کئی بھونرے آئے۔ پر جو لذت اور خوشی میرے باغ کو گل مہر کے ملاپ سے ملی تھی۔ وہ پھر جیون بھر کبھی نہیں ملی۔ اس ایک پل کو پکڑنے کی آس میں میں بہت بھٹکی۔ میں خود سدا پیاسی رہی لیکن غیروں کی پیاس بجھاتی رہی۔ اُن کی میٹھی باتوں کے فریب کھاتی رہی۔ کوئی میرے باغ کی خوبصورتی کی تعریف کرتا۔ مجھ سے پیار کا اقرار کرتا..... تو مجھے اچھا لگتا۔ ایسی باتیں روز ہوتیں ــــ میں سمجھتی تھی کہ پریم کے میٹھے بول میرے درد کا علاج ہیں...... پر میرا مرض لاعلاج تھا ــــ

پھر ایک وقت ایسا آگیا جب میں اِس چور سپاہی کی کھیل کو فضول سمجھنے لگی۔ میرے یوں سمجھنے میں میرا باغ بھی ساتھ دے رہا تھا۔ ہم دونوں چاہتے تھے کہ اپنا آپ کسی کے حوالے کر دیں۔ لیکن ہمیں ویسا کوئی ملا ہی نہیں۔ میرے حسن کے بام عروج نے میرے زوال کو جنم دے دیا تھا اور میرا باغ میرے زوال کے حدود میں داخل ہونے کی تیاری کرنے لگا ــــ میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرا باغ اتنی جلدی محرم کے کالے کپڑے پہن لے گا۔ پت جھڑ

کا موسم یوں دوڑتا ہوا آجائے گا۔ پت جھڑ کا موسم۔ خالی خالی ویران، بد شکل..... پت جھڑ کا موسم، محرم کا ماتم، صدیوں کا غم، اب زندگی دکھوں تکلیفوں تنگیوں اور فکروں میں غرق رہنے لگی۔ کئی بار موت..... میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورنے لگتی۔ میں ڈر جاتی ہیں مرنا نہیں چاہتی تھی لیکن زندگی کے رنگ بھی تو پھیکے پڑ رہے تھے۔ میرے باغ پر زوال کیا شروع ہوا سب یار دلدار پکھیروں کی طرح اڑ گئے۔ میرا کوئی نہ بنا۔ غم کی پگڈنڈی نے مجھے تھکا دیا۔ اندیشوں اور فکروں کی دھند پھیلتی گئی ——— اور یوں ہی جانے کتنی صدیاں بیت گئیں ——— پھر آسمان پر ایک کہرام مچا۔ کالے بادل گرجنے لگے اور زور سے برسنے لگے۔ بجلی کی کڑک سے بادلوں کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہونے لگے۔ دھند صاف ہوتی گئی۔ آسمان ایک بار پھر ہنسنے لگا۔ سورج نے اپنا روپ دکھایا اور مجھے لگا جیسے بادل میرے باغ کی ساری غلاظت دھو کر لے گئے ہیں۔ جیسے میرے باغ کو لگا گہن ختم ہو گیا ہے۔ میری اندھی آنکھوں میں روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں اور مجھے دور ہنستے آسمان میں گل مہر کا وجود دکھائی دینے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ میرا باغ گل مہر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ ایک بار پھر لہرانے لگا۔ گل مہر نزدیک آتا گیا اور آتے آتے میرے باغ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے ساتھ تو کوئی بات نہیں کی لیکن میرے باغ کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو تتلیا زمین سے اکھاڑا اور میرے باغ کے اندر آگیا۔ وہ اندر آتے ہی میرے باغ کے پیلے پتے چننے لگا۔ دوبارہ ہریالی لانے کی ناکام کوشش میں وہ سارے باغ کی گوڈائی کرنے لگا۔ سوکھے پھولوں کی کیاریوں کو پانی دینے لگا ——— اس نے باغ کے چاروں طرف ایک لکشمن ریکھا کھینچی..... اور لکشمن ریکھا کے باہر ایک بڑا بورڈ لگا دیا ——— بورڈ پر موٹے لفظوں سے لکھا تھا..... گھاس پر چلنا منع ہے۔

عجیب خلقت کے بے عیب کارنامے

لوک سرکار نے ایک خفیہ کمیٹی بنائی۔ اِس کمیٹی کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ کیپال کرنٹرلا میں کام کرنے والے سرکاری افسروں کی جائیداد کی چھان بین کرے اور پتہ لگائے کہ ان افسروں نے کس کس ڈھنگ سے اپنی جائیداد بنائی ہے اور جائیداد کی مالیت کیا ہے تاکہ راشی افسروں کے خلاف سخت کارروائی کی جا سکے۔ دو سال کی کھوج اور تحقیق کے بعد کمیٹی نے اپنی رپورٹ لوک سرکار کو پیش کر دی۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق حیران کُن ایسا کوئی بھی افسر نہیں ملا جس نے ناجائز طریقے سے اپنی جائیداد بنائی ہو۔ پر رپورٹ کے آخری حصے میں یہ جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

"یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان افسروں کے قریبی رشتے داروں کے نام پر بڑی بڑی جائیدادیں ہیں۔ ایک افسر کا بھتیجا جو منی بس چلاتا ہے تین کوٹھیوں کا مالک ہے۔ افسر کے بھتیجے کا بیان ہے کہ یہ جائیداد اُس کے باپ نے بنائی تھی...... جو تانگہ بان تھا۔"

کمیٹی کی سفارشوں پر غور کرنے کے لئے لوک سرکار نے ایک بورڈ بنایا جس میں لوک دربار کے کچھ سیانے اور ماہر ممبر لئے گئے۔ ایک سال کے بعد بورڈ نے سرکار کو اپنی قیمتی رائے سے نوازا اور لکھا۔

"لوک تنتری ودھان انوسار دیش کے ہر ناگرک کو جائیداد بنانے کا پورا پورا ادھیکار ہے۔ لوک سرکار کسی کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتی چاہے جائیداد بنانے والا کوئی سرکاری افسر یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو"

آدھے آدمی کی کہانی

اُس مشین کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں، پر لکڑی کی ٹانگیں اُسے اُٹھائے پھرتیں —
اُس کی آنکھیں کھلی تھیں، لیکن ذہن و دل کی کھڑکی بند تھی۔ من کی اندھیری کوٹھری میں کبھی کبھی اُس کی کوئی سوئی ہوئی رگ پھڑکتی مگر مشین کے زنگ آلود پرزوں کے شور میں اُسے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ جب اُسے مشین کے پرزوں کو گریس دینے کے لئے کچھ سِکّوں کی ضرورت پڑتی تو وہ اپنی جھولی پھیلا دیتا — کافی ہاؤس میں آتے جاتے لوگ اُس کی جھولی میں چند سِکّے ڈال دیتے..... اور سکّوں کی جھنکار میں اُس کا دِل، اُس کا ضمیر...... گہری نیند سو جاتا —
— اور آج بھی اُس مشین کو لکڑی کی ٹانگیں اٹھائے پھرتی ہیں۔ لیکن آج..... اُس مشین کا سارا زنگ اُتر چکا ہے۔ وہ اب گہری نیند سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے اُس کے من کی کھڑکی کھل چکی ہے۔ ذہن و دل کی کوٹھری میں اب روشنی ہی روشنی ہے اُسے اب رگوں میں لہو کے دوڑنے کا احساس ہو چکا ہے...... اور اب اُس نے جھولی پھیلانا بند کر دیا ہے — کافی ہاؤس میں آتے جاتے لوگ اب اُس کی جھولی میں شردھا اور شفقت کے پھول ڈالتے جاتے ہیں۔ اور وہ ہنستے ہوئے سب سے کہتا ہے۔
"ہالو جی! لو سٹ بیالیس...... "

سُورج کا گیت

آج کل مرنا بھی اُتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ جینا۔ کفن کے لئے اٹھارہ گز لٹھا کوئی سستا تو ملتا نہیں۔ پھر غسل دینا، قبر بنانا، قُل کرنے، دسواں اور چہلم کرنا۔ لوگوں کا آنا جانا، قرابت داروں کا جمع ہونا ــــ خرچ ہی خرچ۔ ہمارا سماج، ہماری رسمیں..... دماغوں کے تالے، دلوں کی زنجیریں..... توڑے بھی نہیں ٹوٹتیں ــــ باتوں سے تو ہم سماج سدھار اور بڑے ترقی پسند بنتے ہیں۔ لیکن عمل کی کسوٹی پر ہم ہمیشہ کھوٹے سکّے ہی ثابت ہوتے ہیں۔" ــــ یہ باتیں، میں اُس بیمار کے سرہانے بیٹھ کر سوچ رہا ہوں، جس کے دوا دارو نے میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ یہ بیمار جسم اپنے گلے میں الفی پہننے کی تیاری پچھلے سال سے کر رہا ہے تاکہ گورکن گینتی، کرالی اور بیلچہ لے کر شہرِ خموشاں کو جگانے جاتے۔ اخباروں کی سرخیوں میں چھاپیں، دُوردرشن اور ریڈیو سے یہ خبر آئے ــــ "جنگِ آزادی کا مجاہد اور مشہور ادیب پرویز ہاشمی موت کی گہری نیند سو گیا۔ قوم کا عظیم نقصان، لیڈروں کے بیان، ادیبوں کا خراجِ عقیدت"

——— اور یوں ایک مہان ادیب اور جنگِ آزادی کا سپاہی زندۂ جاوید ہو جائے گا ———

پردیپ ہاشمی، میرا باپ، میری ماں کا قاتل، میری زندگی کے اجڑے باغ کا مالی ——— جو اپنے اصولوں، آدرشوں کے پھولوں کو عمر بھر چنتا رہا اور کانٹے میری جھولی میں ڈالتا رہا۔ اُس نے اپنی ساری زندگی کاغذی پھولوں کی بناوٹی خوبصورتی میں گزار دی، پر میرے لئے وہ بدصورتی کا ایک بھیانک سمندر چھوڑ گیا جس میں میرے اُجڑے جیون کی ناؤ ڈگمگا رہی ہے ——— ڈوب رہی ہے ——— میری امّی! جنگِ آزادی کے اِس سپاہی کی معشوق! اِس کی نظموں کی دلوالی...... چمبیلی کی کسی اونچی بیل سے پھسلی اور میرے ابّا کی زندگی کی نظم میں ڈھل گئی۔ نظم پھیلتی گئی ——— لڑی ٹوٹتی گئی ——— نظم بکھرتی گئی۔ اُس میں وزن نہیں رہا۔ توازن نہیں رہا۔ اُس میں زہر بھرتا گیا۔ زہر...... اصولوں کا، آدرشوں کا زہر...... حقیقتوں کا کسیلا کا ——— نظم ایک رات بن گئی۔ سیاہ کالی رات ——— رات لمبی ہوتی گئی ——— نائکہ سکڑتی گئی ——— نائکہ ایک نقطہ بن گئی...... اور نقطہ، میرے ابّا کے اصولوں کی چکّی میں پس کر اپنا وجود کھو بیٹھا ——— پر میرے ابّا نے اپنے وجود کے ارد گرد ایک ایسی چادر اوڑھے رکھی کہ آج تک کوئی بھی اُسے پھاڑ نہیں سکا۔ کوئی اُس چادر کو پھاڑتا بھی کیوں۔ بھلا اُسے ایسا کرنے سے کیا ملتا ——— اصولوں کی کڑواہٹ اور آدرشوں کے کانٹے ——— آج ہمارے اصولوں کا استعمال بڑے سائنٹیفک ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ شرافت کی چادر کے نیچے بڑی عزت کے ساتھ ساری بات چیت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی آدرشوں کا پرانا نسخہ کیوں استعمال کرے۔

میرے ابّا پردیپ ہاشمی...... ترقی پسند لہر کے جنم داتاؤں میں سے تھے۔ کسی زمانہ میں یہ لہر ایک طوفان بنی ہوئی تھی۔ ہمارا گھر اُن دِنوں اکثر اُس طوفان کے بھنور میں پھنسا رہتا۔ قلم کے نئے نئے غازی جو آج شیشوں کے قطب میناروں میں اندھے، گونگے اور

بھرے بنے بیٹھے ہیں، اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ سامراج، جاگیرداری اور غلامی کی زنجیریں کاٹنے، دیش کی آزادی کے لئے، بھوک ونگ مٹانے اور سوشلزم لانے کے لئے، کتنے ہی کاغذ سیاہ کئے جاتے۔ ادب حقیقی زندگی کا ترجمان بننے لگا۔ "تاج محل" میں غریبوں کا لہو دکھائی دینے لگا۔ اخباروں اور رسالوں میں چھپا ہر لفظ آگ کا شعلہ بنا ہوا تھا۔ الفاظ بند دماغوں کے دروازے کھول رہے تھے۔ چنگاریاں اندر جارہی تھیں۔ برف پگھل رہی تھی۔ سفید حاکم آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے۔ ظلم کا کاروبار عام تھا۔۔۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں اُن ہنگاموں سے بے نیاز۔۔۔۔۔ "اتر بیتر" "اور گیند چکر" کھیلا کرتا۔ پر ابا کبھی کبھی چچا غفور سے باتیں کیا کرتے۔

"میری طرح منٹو بھی زندگی کی حقیقتیں لکھتا لکھتا ٹوٹ کے سینی ٹوریم میں جا پہنچا مگر وہاں بھی اُسے بیگو "مصری کی ڈلی" بن کر ملی۔ زندگی کی ایک اور سچائی۔ یہ ترقی پسندی کے علمبردار کتنی دُور جا پہنچے ہیں۔ لیکن پیچھے رہ گئے۔۔۔۔۔ سعادت حسن منٹو اور پرویز ہاشمی۔ جن کے حصّہ میں صرف جیون کے کڑوے سچ ہی آئے یا مینگو سگریٹ اور شراب۔۔۔۔۔ جو تیزاب بن کر ہم دونوں کو سلاخ ہ پھونک گئی۔ پر ہمارے دل اُن سنہری منزلوں کو چھونے کے لئے کبھی نہیں مچلے۔۔۔ لیکن آج ہر چیز مچل رہی ہے۔ ہر شئے بدل رہی ہے۔ زمین دن بہ دن اندر دھنستی جارہی ہے پھٹتی جارہی ہے۔۔۔۔۔ اور آسمان اُونچا ہو رہا ہے۔ اور اُونچا۔۔۔۔۔ خدا سے بھی اُونچا۔۔۔ دھرتی بنجر بنتی جارہی ہے۔ خالی خالی۔۔۔۔۔ اُجڑی اجڑی آسمان میں قوسِ قزح کے رنگ بکھرتے جارہے ہیں۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔ اِس دھرتی کا ایک ذرّہ۔۔۔۔۔ آسمان نہیں بن سکتا۔ کوشش کرنے پر بھی نہیں۔ میری رگوں میں پرویز ہاشمی کا خون ہے۔۔۔۔۔ اور پرویز ہاشمی۔۔۔ ڈاکٹر کچھ نہیں بتاتے۔ میں کیا کروں۔ میرے پاس تو اب فقط خدا کا ہی نام ہے۔ ایک کلرک۔۔۔۔ تین بچوں کا باپ اور تنخواہ دوائیوں کی چند بوتلیں۔

کل لوک سبھا میں خزانہ منتری جی بھاشن دے رہے تھے..... دیش کی اقتصادی
حالت سدھر رہی ہے۔" روپے کی قیمت ۲۵ پیسے رہ گئی ہے۔ ارتھک ستھتی ۲۵ پیسے
کلو۔ کتنی سستی اور مظبوط چیز ہے۔ پر آٹا، چاول، دال، تیل اور کپڑے کا بھاؤ ۔۔۔ اُف
خدا۔ زندگی ایک مُصیبت بن چکی ہے۔ کل سیکریٹری صاحب کہہ رہے تھے۔
"بھائی! تم لوگ مہنگائی الاؤنس کے لئے کب جلوس نکال رہے ہو۔ ہمارے پاس
تو کار میں پیٹرول ڈالنے کے لئے پیسے ہی نہیں نکلتے۔"
سیکریٹری صاحب کو پیٹرول چاہیئے..... کار میں ڈالنے کے لئے.....اور
.....پیٹ کی مشین کے لئے۔ مگر پیٹرول تو بڑا مہنگا ہے۔ ہر دن مہنگا ہو جاتا ہے۔
غرق ہو جائے اِن عربوں کا.... تیل نہ ہوا، گُل بکاؤلی کا پھول ہو گیا اور مولا آباد
اپنے معزز اور باعزت شہریوں کو، بھلا مہنگائی کے لئے اُن کا کیا قصور ہے۔
—— آپا نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھنے لگا۔
بیماری کے باوجود اُس کے چہرے پر سکون تھا، صبر تھا۔ اُس کی آنکھیں میرے چہرے
پھیکے رنگوں کو پڑھنے لگیں۔ اُس نے اشارے سے دوائی پلانے کے لئے کہا۔ میں
گھڑی دیکھی۔ دوائی کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے دوائی پلائی۔ دوائی پینے
اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ اور مجھ سے مخاطب ہوا۔
"میری اِس لمبی بیماری نے تمہیں بڑا تنگ کر دیا ہے۔ میں خود بھی تنگ آ چکا
سال بھر سے چارپائی پر پڑا ہوں۔ سب کچھ چھوٹ چکا ہے۔ سب ختم ہو چکا ہے
ولولے، جذبات۔ وہ ادب، وہ ادیب ۔۔۔ آج کے بڑے بڑے ڈھنڈورچی میں اُن
ساتھ نہیں چل سکا۔ اپنے اصولوں کے کارن، جو مجھے تم سے بھی پیارے ہیں۔ اور جب
تک اِن بوڑھی ہڈیوں میں روح کہیں اٹکی ہوئی ہے۔ میں اپنے پیار کو دھوکا نہیں

سکتا ــــ بیٹا! ہم نے بڑی محنت سے اِس دھرتی پر چیرخہ کاتا تھا۔ پر کچھ کپڑے ڈھیلے نکلے! اور کچھ کپاس ہی خراب نکلی۔ کاش میں ایک زندہ لاش نہ ہوتا۔ مجھ میں تو اب طاقت نہیں رہی۔ یہ مٹی اب مٹی میں مل رہی ہے۔ لیکن تم تو جوان ہو۔ تمہیں میرے پاس بیٹھ کر کیا ملے گا۔ تمہیں خدا نے طاقت دی ہے، عقل دی ہے۔ تم کھیتی باڑی کے نئے نئے طریقے سیکھ سکتے ہو۔ انقلابی کھاد اور شفاف پانی سے چاروں سمت ہریالی لا سکتے ہو۔ تمہیں پریشانی کیوں ہو ــــ پریشانی کا علاج گھر میں بیٹھ کر نہیں ہوتا۔ اُٹھو میرے بیٹے! باہر نکلو تمہارے ایسے کتنے ہی ساتھی تمہیں تیار ملیں گے۔ تمہیں اُن کے ساتھ مِل کر چلنا ہے۔ کندھے کے ساتھ کندھا اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ ملا کر۔ اُٹھو! سچی لگن اور محنت سے ہل چلاؤ۔ خوب فصل پیدا کرو۔ بنجر زمین کو آباد کرو۔ بڑے بڑے پتھروں کو بارود سے اُڑا دو۔ دھرتی کو صاحب کرو۔ اِن پتھروں سے اور زمین کو ہموار بناؤ ــــ پھر دیکھنا بیٹا! اِس زمین کا ہر ذرّہ آفتاب ہو جائے گا۔“

ــــ باتیں سُن کر مجھے لگا کہ یہ دیر ہاشمی، میرے ابّا جان...... آج بھی جوان ہیں۔ لوہے کے ساتھ کھیلنے والے اور میں...... اُن کا بیٹا، اُن کی جگہ..... چارپائی پر لیٹا ہوں ــــ ایک بیمار ذہن، مردہ جسم، سکڑا وجود ــــ پھر میں اچانک اُٹھا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ میں نے دیکھا ــــ باہر، دور...... لاکھوں میل دُور...... سورج کرنوں کی سیڑھی سے آہستہ آہستہ دھرتی پر اُتر رہا ہے۔ میں گھر سے باہر نکل آیا...... اور سورج کو پکڑنے کے لئے دوڑ پڑا ــــ میری آواز پر ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آوازیں میرے ساتھ مِل گئیں۔ آوازوں نے گیت بنایا۔ قدموں نے تال دیا۔ قدم بڑھ رہے ہیں ــــ گیت گونج رہا ہے ــــ گیت سُورج کا، گیت دھرتی کا...... اور سورج نزدیک آتا جا رہا ہے۔

ٹھنڈی کانگڑی

میرے مکان کی چھت کشمیری مزدور کی طرح برف کا بھاری بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے وہ تھکاوٹ سے چُور ہے۔ اُس کے ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا ہے۔ بڑی پیاری آواز ہے ٹپ ٹپ ...... ٹپ ٹپ۔ کشمیر کا ہر موسم سُہانا ہوتا ہے۔ کیا باغوں کے کِھلنے کا اور کیا چناروں کے سُرخ پتے اکٹھا کرنے کا۔ لیکن ..... اگر یہاں جاڑے کا موسم کاٹنا ہو تو اور گرم چیزوں کے ساتھ ساتھ کانگڑی ضرور تاپنی پڑتی ہے۔ کانگڑی .... فرن میں، کمبل میں، لحاف میں .... بڑی گرمی دیتی ہے۔

سردی شدت کی ہے پر میرا کمرہ بڑا گرم ہے، جیسے آتش دان۔ کھڑکیاں، دروازے بند ـــــ روشن دانوں پر کاغذ چپکائے ہوئے ـــــ کیا مجال جو ٹھنڈ رتی بھر بھی اندر آجائے۔ ہیٹر چل رہا ہے۔ پہلے میں انگاری جلاتا تھا۔ پر اب .... کون پندرہ روپے من لکڑی خریدے اور وہ بھی گیلی۔ دھواں ہی دھواں ..... پیسوں کی بربادی۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ لین دین کا رواج بھی تو خوب ترقی پر ہے۔ چار یا پانچ روپے مہینہ خرچ کیجئے۔ پھر چاہے ..... ہیٹر جلاؤ۔ بوائلر لگاؤ۔ پریس لگاؤ۔ زیادہ سے زیادہ تو دس روپے ماہوار بجلی کا بل آجائے گا

زمانہ چاند پر جا رہا ہے ۔ ترقی ہی ترقی ہے ۔

—— ہاں، تو میرے کمرے کے اندر بڑی گرمی ہے ۔ کیوں نہ ہو ۔ ڈو ڈو ہیٹر جو چل رہے ہیں ۔ ایک رُوم ہیٹر اور دوسرا ..... جی ہاں! کانگڑی ۔ یہ میں نے ابھی پچھلے سال ہی خریدی ہے، لیکن بڑی مہنگی ۔ آج تو ہر چیز بڑی مہنگی ملتی ہے ۔ کانگڑی بھی ..... مہنگائی کا زمانہ جو ہوا ۔

اِس لحاف کے اندر کانگڑی سر درد دیتی ہے ۔ باہر بہت سردی ہے ۔ پر میرے مکان کی چھت سے پسینہ ٹپک رہا ہے ۔ ٹپ ٹپ ..... ٹپ ٹپ ـــ میرے کمرے میں ہیٹر جل رہا ہے ۔ میری رضائی میں ایک کانگڑی ہے اور کانگڑی میں ..... آگ ہی آگ ہے ۔ رضائی چل رہی ہے ۔ گاڑی کے اِنجن کی طرح ۔ فائر مین اِنجن کی بھٹی میں کوئلے ڈال رہا ہے ۔ اِنجن اُبل رہا ہے ۔ بھاپ نکل رہی ہے ۔ گاڑی چل رہی ہے ۔ رفتار بہت تیز ہے اسٹیشن آنے ہی والا ہے ـــــ اِنجن خود رُک جائے گا ۔ فکر کی کوئی بات نہیں ۔ میرا بستر کبھی کانگڑی سے نہیں جلا ۔ ہم کشمیری تو اس کے عادی ہوتے ہیں ۔ جس رات میرا بستر سرد رہے، مجھے تو نیند ہی نہیں آتی ۔

میرا مکان جھیل ڈل میں ہے ۔ ڈل میں ہاؤس بوٹ بھی ہوتے ہیں ـــ اور اس ہاؤس بوٹ نے جو میرے کمرے کی کھڑکی کے بالکل سامنے کھڑا ہے ۔ ایک ولایتی جوڑے کو اپنے دل داد جگر میں بٹھایا ہے ـــ میں اِس ولائتی جوڑے کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتا رہتا ہوں ۔ اِس خوبصورت اور البھڑ جوڑے کے جسمانی کرتب کا نظارہ کرتا رہتا ہوں ۔ اِن کو ورزش کرنے کے نئے نئے ڈھنگ آتے ہیں ۔ تبھی تو کتنی پیاری صحت ہوتی ہے اِن لوگوں کی ـــ بالکل ہمارے امبری سیب ایسی ـــ اور پھر میرے کمرے کی کھڑکی کے آگے پردہ آجاتا ہے ۔ ..... اور میں بھی ورزش کرنے لگتا ہوں ۔

ورزش صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ شریر کو چست بناتی ہے۔ کئی بیماریوں کا علاج کرتی ہے۔ یہ من کو شانتی دیتی ہے — لیکن..... ورزش کرنے سے بھوک بڑھتی ہے۔ بھوک من کی..... بھوک پیٹ کی۔ ایک کا علاج تو میرے پاس ہے مگر دوسری کا علاج کون کرے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ دال روٹی بہت مشکل سے ملتی ہے۔ دودھ، انڈا، گوشت کہاں سے کھائیں۔

میرے سامنے والے ہاؤس بوٹ کے اندر ولایتی جوڑا ورزش کرنے کے بعد ہیوی بریک فاسٹ لیتا ہے۔ دیسی گھی میں بھنا ہوا انڈوں کا حلوہ، فرائی کیے ہوئے شامی کباب، دودھ، دہی..... پورا ٹیبل بھرا ہوا ہے اور منٹوں میں صاف ہو جاتا ہے — ہم بھی..... ناشتہ کرتے ہیں..... دودھ کے بغیر کڑوی نمکین چائے اور رات کی باسی چپاتی کے ساتھ۔

ورزش دونوں جگہ ہوتی ہے — ان کا روپ دن بدن نکھر رہا ہے..... سورج مکھی کے پھول کی طرح اور..... میرے شریر کا ماس گھل رہا ہے..... ہڈیاں باہر آرہی ہیں —

— موسم اب بدل رہا ہے فصلِ بہاراں اٹکھیلیاں لے رہی ہے۔ بادام واری کا میلہ لگا ہے۔ عشق پیچاں کی پنکھڑیاں دعوتِ نظارہ دینے لگی ہیں..... اور ولایتی جوڑا روز ورزش کرتا ہے روز طاقتی خوراک کھاتا ہے — پر اب میرے جسم میں ڈنڈ پیلنے کی سکت نہیں رہی ہے۔

پھر ایک دن..... ہاؤس بوٹ کا دل اداس ہو گیا۔ وہ دلکش جوڑا اپنے جیون کے پُرکیف یادگاری دنوں کی سبھی یادیں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا — ہاؤس بوٹ اب خالی ہو چکا ہے۔ اور میرا کمرہ بھی۔ روم ہیٹر جلنا اب بند ہو چکا ہے۔ کانگڑی میں اب صرف راکھ ہی راکھ ہے..... اور میرا بستر کسی برہا کی چتا بن چکا ہے۔ میرے مکان کی چھت اب بالکل ننگی ہے۔ اس پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ اس کے ماتھے سے اب پسینہ نہیں ٹپکتا۔ پر اب یہ میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے — کیونکہ میں..... ایک تیسرے درجہ کا مریض درگجن کے ٹی بی ہسپتال میں لیٹا، شاید اپنے آخری سانس لے رہا ہوں۔

گوری فصل کے سوداگر

برگد کا سیاہ بوڑھا پیڑ رات کی تاریکیوں میں اپنے ذہن و عقل کے دریچوں کو مقفل کر کے ایک پُر اسرار کھیل میں اُلجھ کے رہ جاتا ہے اور ہر صبح وادیٔ گُل پوش کے کسی گُل کی طرح حسین، گرم سورج کی ٹھنڈی کرنوں سے دُھلا اِس کا چہرہ.... ہر شخص اِس کے لمس کو پانے کی خواہش میں رہتا ہے۔

ہاں! یہ وہی برگد کا پیڑ ہے جو کبھی یخ بستہ ہواؤں میں، سمندر کی خوفناک لہروں میں، کالے بادلوں کی چادروں میں اپنی درخشاں چہرگی کو سنبھالے ہوئے اپنے گردِ وہی لوہے کی فصیل سے جا ٹکرایا تھا۔ پیرامڈ کی دیو مالاؤں کو ظلمت کے پہاڑوں کو.... ریزہ ریزہ کرنے کی جدو جہد میں زمین کی سختیاں سہتا تھا اور اپنے آہنی ارادوں سے دھرتی پر اُگی ہر فصل کو بچایا تھا، کیونکہ اُس فصل کے ٹوٹے چہرے بے سبب جرم سے پناہ مانگتے تھے۔ اور برگد کا پیڑ.... کہ جس کی دانشوری سیاست و فراست کی دھوم تھی..... اپنے وجود میں ثابت و سالم، نفس نفس فکر کے زاویے بناتا رہتا۔ اُس کے ذہن کی ہر دش گپھاؤں میں جانے کتنے خیالات روپوش رہتے۔ اور جب

جب روشن گپھاؤں سے اجلی کرنیں ٹوٹے چہروں پر پڑتیں ..... انہیں ان کا شہر آرزو آباد ہوتے دکھائی دیتا ـــــ اور پھر ایک دن ـــــ برگد کے پیڑ نے ٹوٹے چہروں کو صدیوں کی پیاس بجھانے کے لئے سمندر لا کر دیا۔ اس روز نیم کے منڈوے تلے بیٹھا وہ بے غم پگلا منصور چلا اٹھا تھا..... "یہ سمندر، مگر سراب کا ہے..... سراب کا ہے..... سراب کا ہے، رجنی گندھا کے پھول باسی ہیں..... باسی ہیں..... پھول باسی ہیں، چھپکلی مکھی کا شکار کر رہی ہے..... چھپکلی..... مکھی....." ـــــ اس کی آواز بستی کی گرم ہوا کھا گئی اور یوں برگد کا پیڑ ان کے خوابوں کا خریدار بنا۔ بوڑھے برگد کے قدموں کے نیچے مہتاب و کہکشاں کی بلندیاں آ گئیں لامکاں اس کے قبضۂ اختیار میں ہوا۔ خاک و باد پر اس کی حکمرانی قائم ہوئی اور اس امر نے اس کو اس عمر میں بھی توانا بنا دیا۔ اس کے اندر چھپا جوبن اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے لگا ـــــ اور بوڑھے برگد کے پیڑ کے سایے میں پلنے والا صنوبر کا وہ کم سن شجر کہ جس کی بھینی بھینی مہک بوڑھے برگد کے لاشعور میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے ذہن و دل پر ایک وجد طاری کر دیتی ہے اور ہاں!..... یہی وہ ساتھی ہے کہ جس کے ساتھ رات کی تاریکیوں میں پُر اسرار کھیل کھیلا جاتا ہے ـــــ کھیل..... جو کھلاڑی کے لئے تسکین کا سامان ہو جاتا ہے۔ اس کا کشکولِ آرزو بھرتا ہے۔ اس کے فلسفے، افکار و نظریات کو چند لمحوں کے لئے ساکت کر دیتا ہے۔ وہ کمسن شجر، جو کچی شاخوں پہ اٹھتی ہوئی مہکتی ہوئی ..... بلوغیت کی لذت محسوس کرنے لگا ہے۔ اب اپنے لئے بھی راحت کا سامان چاہتا ہے اور پھر ایک روز ـــــ وہ مخاطب ہوا۔

"دھوپ کا ایک ٹکڑا..... میرے آنگن میں روز آتا ہے۔ یہ دھوپ کا ٹکڑا، مندر کے پچھواڑے سے ابھرتا ہے۔ اندھی گلیوں کو چیرتا ہوا، کھلی فضاؤں میں مجھے پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی روشنی میرے لئے ہے۔ اس کا سب کچھ تیرا ہے..... وہ مجھ سے ملا

چمبیلی کی طرح لپٹ جاتا ہے ..... میرے ذہن و دل کو سہلاتا ہے۔"

کم سن شجر مہک رہا ہے، چہک رہا ہے وہ روز ...... دن کی اندھی روشنی میں خلوتوں میں جاتا ہے اور جلوتوں کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ خلاؤں کے دیس میں بھورے پہاڑوں اور زرد ٹیلوں کے نیچے ..... دھوپ کے ٹکڑے میں سما جاتا ہے اور طلسم ہوش ربا بن جاتا ہے۔ —— بوڑھا برگد اب بھی ہر رات کم سن شجر کے ساتھ ایک پُر اسرار کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ لیکن —— اب صنوبر کا شجر رُت بدل رہا ہے۔ اُس میں لمحہ لمحہ تبدیلی آتی جاتی ہے۔ بوڑھا برگد یہ تبدیلی محسوس کر رہا ہے۔ وہ خاموش ہے۔ اُس نے اُسے کانچ کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے۔ پر دھوپ کا لمس کم سن شجر کے جسم و جان میں ایک کہرام مچائے ہوتے ہے۔ وہ بلوری پتھروں کو توڑنا چاہتا ہے اور خلاؤں میں اڑنا چاہتا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ اُس کی جڑیں ابھی نازک ہیں۔ تنے نازک ہیں۔ وہ بوڑھے برگد کے آسرے کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اور بوڑھا برگد ..... اُس کے جسم پر رینگتا رہتا ہے —— اور یہ اِک برگ آوارہ ..... کم سن شجر کا رازدار۔ پیغام رساں دھوپ کے ٹکڑے کا، بنملی ہاتھ میں لئے اِک سپیرا ..... مست شباب دھوپ کے ٹکڑے کو اپنی پٹاری میں قید کرنے کی فکر میں، جانے کب سے ستاروں پر کمند ڈالتا رہا۔ اُسے بنملی کی مست سُروں میں ڈھالتا رہا۔ ویران بستیوں میں، جاگتے ویرانوں میں ..... وہ اُسے لئے پھرتا رہا۔ کم سن شجر کے گھونسلے میں میٹھا من کا پنچھی پھڑ پھڑاتا رہتا —— اور برگِ آوارہ —— سیپیوں کا سوداگر ..... موتی کی لذّت کے لئے مچلنے لگا۔ اُس کے خون میں تحریک اُبھری۔ طلسم ٹوٹا۔ آواز کا مدہم شور ..... آوازیں دب کے رہ گیا۔ دریا کا پانی فطرت میں سما گیا۔ دھوپ شمع بنی۔ شمع جلنے لگی، پگھلنے لگی۔ روز جلتی رہی ..... پگھلتی رہی —— اِک سمجھوتہ ہوا تھا رازداری کا، بوڑھے برگد کے سیاہ پیڑ اور صنوبر کے کم سن شجر کے درمیان۔ اِک سمجھوتہ کیا برگِ آوارہ نے —— اب دھوپ کا ٹکڑا اُس کی آسیب زدہ چوکھٹ کے اندر بھی آنے لگا۔ رجنی گندھا کے باسی پھول

کھلنے لگے۔ اور یہ تکوینی سلسلہ چلتا رہا۔

دِن کے اُجالوں میں ..... اِس بیچ بوڑھا برگد دھرتی پہ اُگی فصل کے تردد بکھرے چہرد
اپنے فہم و فراست سے روز و شب میں غرق کرتا رہا۔ وہ جو صلیب پہ چڑھنے والے تھے رو
ماہتاب و کہکشاں کی بلندیاں دینے والے تھے —— اُن میں اندھے اعتقاد کی دیواریں لرز
رہی تھیں۔ بوڑھا برگد اپنے تیز دانتوں سے ریت چباتے چباتے صلیب کے پیاسوں کی پیاس
بجھانے لگا۔ اُس کا ہر برگ خنجر بنا۔ کچے رنگوں کے پیراہن سسکنے لگے۔ آدھی ادھوری چاندنی
رو رگ بننے لگی۔ دور اُفق میں دھواں دھواں بادل اُڑنے لگے۔ اور بوڑھا برگد..... اپنے بے ج
وجود کو آندھیوں سے ڈھانپنے لگا۔ سنگلاخ زمین پہ غیر فرقہ دارانہ برادری..... امن و آشتی۔
مرلوٹا اقتصادیت اور قومی سربلندی کے بے رنگ فاصلے..... کاغذی گھوڑوں پر سفر کرنے لگ
اور بدظن ہوئے وہ گھوڑے جو عربی و تمرکی تھے۔ وقت بدلا، قدریں بدلیں —— مندروں
مسجدوں میں..... زمانے کی نیرنگیوں کے خطبے پڑھے جانے لگے —— اور اِس کوری کتاب
اوراق میں گُم..... بوڑھے برگد کا سیاہ پیڑ رات کی تاریکیوں میں اپنے ذہن دل کی تسکین
کے لئے پُراسرار کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ صنوبر کے کم سِن شجر کے ساتھ جواب کنارہ کنارہ دور
جاتا ہے۔ جس کے دِل کا پنچھی اب ہر دھوپ کے ٹکڑے کو دیکھ کر پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ جواب
دُور پھیلی ہوئی، بکھری ہوئی ننگی دھوپ کو کھا جانا چاہتا ہے۔ کم سِن شجر کے آنگن میں اب
روز دھوپ کی کرنیں اُترتی ہیں اور اُسے اڑن کھٹولے پہ ہچکولے دیتی ہیں —— اب غزنوی
تڑپ تو ہے پر زلفِ ایاز میں خم نہ رہا۔ فاصلہ بڑھنے لگا —— فاصلہ بڑھتا گیا —— سمجھوتہ ٹوٹنے
سمجھوتہ جو ہوا تھا —— رازداری کا، بوڑھے برگد کے سیاہ پیڑ اور صنوبر کے کم سِن شجر کے بیچ۔
اور یوں کم سِن شجر لق و دق شہروں کی بھیڑ میں دھوپ کی کرنوں سے غسل کرتا رہا۔ اُس کی اِس
سے بوڑھا برگد اپنے آپ کو بے آب و گیاہ ریگستان میں تنہا محسوس کرنے لگا —— اُس کی آنکھوں

میں دھوپ کی کرنیں تیر بن کر چبھنے لگیں۔ وہ چاروں سمت پھیلے اندھیرے کی آگ میں جلنے لگا۔ آگ پھیلتی رہی ــــ شعلے بھڑکتے رہے اور اس کی سوچ کے دریچے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس نے دیومالاؤں کے راکشس کا روپ دھار لیا اور اپنے آہنی پنجوں سے کم سن شجر کو دبوچ لیا۔ برگ چھریاں بن کر چھریاں اس کے تن میں پیوست ہو گئیں۔ کم سن شجر جو کم سنی کے داغ کو اپنی پیشانی سے مٹانے کی تگ و دو میں لگا تھا ..... جو اپنے آپ کو مضبوط سمجھنے لگا تھا۔ اس کی جڑوں سے لہو کی بوندیں رسنے لگیں۔ لہو رستا رہا اور شعلوں کو ٹھنڈا کرتا رہا یہاں تک کہ آگ ــــ راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ ــــ اور پھر راکھ ...... کم سن شجر کے قتل پر پچھتانے لگی۔ ہر قاتل کی طرح ــــ بوڑھے برگد کی راتیں ویران ہو گئیں۔ وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہنے لگا۔ اداسی اور کرب کی اندھی کھائیوں میں غرق ہونے لگا۔ وہ ٹوٹنے لگا۔ بکھرنے لگا ــــ وہ جو آہنی ارادوں کے مینار کی طرح اگا تھا ..... ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ اس کا وہ پُراسرار کھیل ...... جو اس کا کشکول آرزو بھرتا تھا، اب ماضی کی یاد بن چکا تھا۔ اور یاد اسے تڑپا کے رکھ دیتی۔ وہ بھینی بھینی مہک جو اس کے لاشعور میں رچ بس گئی تھی، اس کے ذہن و دل پر وجد طاری کر دیتی تھی۔ وہ مہک ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اس مہک کو پھر مٹھی میں بند کرنے کی ناکام جد و جہد میں وہ خود لمحہ لمحہ ہوا میں تحلیل ہوتا گیا۔ اس کی درخشاں ہریالی زرد رنگوں میں جذب ہوتی گئی۔ پتے جھڑتے گئے۔ شاخیں ٹوٹتی گئیں ــــ اور ایک دن ...... ریت کے صحرا میں کھڑا ویران، اداس، سوکھا، بے برگ برگد طوفان کی زد میں آ گیا۔ وہ تیز آندھی میں اپنے وجود کو نہ سنبھال سکا۔ وہ گر پڑا ..... وہ ختم ہو گیا۔ ..... ہمیشہ کے لیے ــــ اور تسکین کا سامان ہو گیا۔ اندھے اعتقاد کی دیواریں توڑنے والوں کے لیے۔ کچے رنگوں کے پیراہن مسکرانے لگے۔ گنگنانے لگے کہ شاید اب رُت بدلے گی اور لالہ کے پھول کھلیں گے۔

قیامت

سات پیالے مٹی کے..... الگ الگ رنگوں کے..... منقش ـــ آبنوں کی کشتی

خیرات ـــ

اور میں ـــ کبھو کا پیاسا صدیوں کا..... ایک رنگ کا کشکول لیے ـــ خالی
..... تنہا تنہا..... کسی نے مجھ کو بھیک نہ دی کسی نے میرا رنگ نہ دیکھا ـــ میں...
ویران جنگلوں کا مسافر..... گمنام وادیوں میں بھٹکتا رہا ـــ نسل در نسل ـ صدی
پھر اِک جرأتِ رندانہ ـــ سات پیالے مٹی کے..... الگ الگ رنگوں کے
منقش ـــ ٹوٹ گئے ـــ اور میں..... ایک سمندر بن گیا ـــ اُس دن
نے گلے میں ایک تختی لٹکائی۔ جس پر لکھا تھا..... قیامت آگئی ہے۔"

نئے آدم کا خواب

سڑک کو اُکھاڑنے کے لئے کُدال جب سڑک کے چوڑے سینے میں بھونکی گئی تو اُس کا سارا شریر کانپ اُٹھا۔ وہ اپنی بربادی اور بدنصیبی کی تصویر کو سامنے ایزل پہ سجے کینوس پر دیکھ رہی تھی۔ رنگوں کا ایک کلاکار پنسل سے کئی زاویے کینوس پر بنا رہا تھا۔ اِس سڑک پر چلنے والے، ساتھ والی گلیوں سے گزرنے والے مسافر، سڑک کو اُجڑتے دیکھ رہے تھے، پر وہ سب خاموش تھے۔ وہ بولتے بھی کیونکر۔ اُن پر تو اُنگلیاں اُٹھتی ہیں۔ اُنگلیاں..... چھوٹی، بڑی، لمبی، موٹی اُنگلیاں..... اِس سڑک کو سنگارنے کے الزام میں۔ اُنگلیوں کا کہنا ہے کہ جب ملگجی شام کا دھندلکا پھیلنے لگتا ہے تو سڑک کی روشنیاں اپنی آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ پھر اس سڑک پر، ساتھ لگتی گلیوں میں، سڑک کے دونوں کناروں پر سجی دکانوں میں..... لاجوردی، پکھراجی، زمردی، فیروزی آجانے تھرکنے لگتے ہیں۔ پھر یہ سڑک ایک ایسے جزیرے کا روپ دھار لیتی ہے۔ جہاں زندگی کے کئی رنگ، رنگوں کے سحر میں جذب ہو جاتے ہیں..... اور ایک ہی رنگ میں گھُل جاتے ہیں۔..... اور دیکھنے والی ساری آنکھیں اندھی ہو جاتی

ہیں۔ پھر اُن آنکھوں سے ایک ہی رنگ ٹپکنے لگتا ہے۔ میلا اسا زہر آلود پیپ سے لت پت، گندھک ایسا رنگ ــــ اور انگلیاں اس سڑک پر چلنے والوں کے قدم ناپتی رہتی ہیں۔

اور جو اس سڑک کو تباہی سے بچانے کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ خوش ہیں کیونکہ وہ تو اسے مٹانا چاہتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ سڑک ایک دھوکا ہے..... سراب ہے.... ایک سپنا ہے، حقیقت سے بہت دور۔ اس سڑک کو ویران بنانے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنہیں کبھی بھی اس سڑک کی صحیح پہچان میسر نہیں ہو سکی۔ انہوں نے اُس کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی بہت کوشش کی، لیکن سڑک ہمیشہ رشتہ توڑ دیتی رہی ــــ کیونکہ گھوڑا گھاس سے یاری لگائے تو بھوکا مر جائے۔ یہ سڑک جو دور آگے چل کر جرنیلی سڑک سے جا ملتی ہے۔ بے شمار پگڈنڈیوں کو جنم دیتی ہے..... اور پگڈنڈیوں پر چل چل کر صندل کے پاؤں جانے گھستے کیوں نہیں ــــ مگر آج یہ سڑک..... اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی ہے۔ کدال اس کا سینہ چیر رہی ہے۔

سڑک کے کناروں پر سجی دکانیں ــــ یہ سائیکلوں کی دُکان، قسم قسم کے سائیکل..... ہیرو، ایٹلس، فلپس، ہرکیولس، ٹائر ٹیوبیں اور سپیئر پارٹس سے بھری دُکان۔ یہ حلوائی کی دکان..... دودھ، دہی، ملائی، پیچ دار جلیبیاں، برفی، موتی چور کے لڈو، رس گلے..... من پسند مٹھائیاں ــــ ڈاکٹر کا کلینک..... خون، پیشاب، تھوک ٹیسٹ کرنے کے آلات، خاندانی منصوبہ بندی کے پیچ وخم سنوارنے والے اوزار ــــ کتابوں کا سٹال..... ہر قسم کا مال سکولوں، کالجوں کی کتابیں، شکسپیئر کے ڈراموں سے لے کر..... جل پری، کام سترٗ سونتی، پلے بوائے..... اندھیرے میں غرق کرنے والی اور بہت سی کتابیں۔ ننگے پن کا لاؤ لشکر۔ سن مائیکہ کی خوبصورت جلدوں والی کتابیں، چکنی اور ملائم..... جن پر ہر چیز پھسل جائے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ضمیر ایک کتے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اور کتے کے گلے میں پڑی زنجیر کھل جاتی ہے۔ وہ تب تک آزاد گھومتا

رہتا ہے جب تک اُسے گوشت کا ٹکڑا نہیں مل جاتا۔ اِن کتابوں کو پڑھ کر پیراہن میں آگ لگ جاتی ہے مگر آگ کے چہرے ٹھنڈے رہتے ہیں۔ برف کے غلاف اوڑھے، فریج میں لگے ہوتے — اِس سڑک کے ساتھ کئی گلیاں ملتی ہیں اور یہ گلی والی گلی...... مختلف رنگوں سے آراستہ...... بہت مشہور ہے۔ یہاں عیاشی، خرمستی، بدنصیبی اور کئی دوسرے روگوں کا علاج ہوتا ہے۔ ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک علاج — یہاں لوگ اپنا علاج کرانے آتے ہیں۔ بڑی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بہت دیر تک تو باری ہی نہیں آتی۔ رنگوں کا کلاکار بھی یہاں کئی بار آیا ہے۔ ساگر پھلانگ کر، پہاڑوں میں پھیلی ہوئی لمبی لمبی پگڈنڈیوں اور میدانوں کا سفر طے کر کے...... اپنا علاج کرانے۔ علاج...... اندھی آنکھوں میں روشنی بھرنے کا، انسانی جسم کا ایکسرے کرنے والی آنکھوں کا، لوگوں کے بخشے ہوئے الفاظ کے معنی ڈھونڈنے کا — یہ کل یگ ہے۔ یہاں ہر شئے کا علاج مل جاتا ہے۔ یہاں روشنی بکھری پڑی ہے۔ لیکن روشنی کے احساس کو اپنے اندر زندہ کون کرے — یہ سڑک، یہ گلی، کلاکار سے بہت کچھ مانگتی ہے۔ یہاں چلتی پھرتی بے نور آنکھیں...... ایک سوال بن کر اُس کے چہرے پر اٹک جاتی ہیں۔ لیکن یہ سوال تو دوسرے لوگوں سے بھی اپنا جواب مانگتا رہتا ہے، جو کلاکار کی طرح ہی اِن گلیوں کے راہی ہیں — وہ سوال کا جواب دینا چاہتا ہے مگر یہاں کی دھندلی شامیں، روشن راتیں، جواب سننا ہی نہیں چاہتیں یہاں مسافر سجی سجائی دکانوں کے شوکیسوں میں رکھی چیزوں کو دیکھتے رہتے ہیں، پرکھتے رہتے ہیں۔ اور پھر من پسند چیز کو منہ مانگے داموں خرید لیتے ہیں۔ شوکیس میں پھر کوئی نئی شئے سجا دی جاتی ہے — خرید و فروخت کا یہ بیوپار، لین دین کی یہ تجارت بڑے زوروں سے چلتی رہتی ہے، کیونکہ وقت کا بنجارہ یہ کاروبار ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتا آیا ہے۔ یہاں بھی بالکل کاروباری منڈی کا منظر ہوتا ہے — اور سڑک پر مسافر چلتے رہتے ہیں...... دن رات — لیکن آج اِس سڑک کا خوبصورت اور دلکش سینہ چیرا جا رہا ہے۔ مزدور کدال چلا رہے

ہیں۔ اُس سڑک کو اُکھاڑا جا رہا ہے جہاں رات جاگتی ہے اور دن سوتا ہے۔ ایک ایسی رات، جس کی کوکھ سے صبح جنم لیتے ہوئے شرماتی ہے ــــ اِس سڑک نے ہمیشہ خوشبو کے پٹوں کو اپنے جسم سے ٹکراتے دیکھا ہے … مگر آج یہ سڑک رنگوں کے کلاکار کو دُور ایک کونے میں کھڑا دیکھ رہی ہے، ایزل پہ چڑھے کینوس پر خاکہ بناتے ہوئے۔ ویسے تو یہ سڑک زندگی کے کئی حادثوں سے گزری ہے مگر آج کا حادثہ سب سے بڑا ہے۔ بہت ہی بھیانک کسی شدید زلزلے کی طرح۔ کلاکار سڑک کے سارے زاویے ناپ رہا ہے۔ لیکن اُس کا ہر زاویہ گلی کے چوبارے پر مہک رہے موتیے کے پھول پر جا کے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ موتیے کے پھول کو سڑک اُکھڑنے سے پہلے یہاں سے لے جانا چاہتا ہے۔ کلاکار اُسے سمجھاتا ہے۔

یہ مہک سدا نہیں رہتی۔ یہ باغ بہاریں ہمیشہ نہیں رہتیں۔ آ میرے کینوس کے خوشگوار رنگوں میں جذب ہو جا۔ میں تمہارے اندر کی روشنی کو زندہ کر دوں گا۔ میں تمہارے لئے زندگی کی راہ ہموار بنا دوں گا۔ میری سوچ کا سمندر بہت گہرا ہے۔ میں ریت پھانکتے صحرا کی پیاس بجھا دوں گا۔ میں سانپوں کی تیز جیبھیں کھا جاؤں گا۔ میں زہر پی لوں گا …… اور تمہیں دُور بہت دُور لے جاؤں گا۔ جہاں قابیل اور ہابیل کی کہانی نہ دھرائی جاتی ہو۔ میں ایک نئی دنیا بسانے کے لئے ایک نیا آدم بن جاؤں گا۔ میں قطرہ نچوڑوں گا ــــ قطرہ تمہارے اندر ڈھل کر ایک ساگر بن جائے گا ــــ ساگر کی پیاس بجھانے کے لئے ہم محنت کریں گے اور محنت کے سہارے جیون کو سکھی بنائیں گے کیونکہ محنت کا رنگ سب رنگوں سے پکا اور سچا ہے۔" ــــ پر اُس کی بات ہواؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ موتیے کا شوخ پھول اُسے ہر وقت ایک روکھا سا جواب دیتا ہے۔

"میں محنت کروں۔ کام کروں۔ میں کوئی نوکر نہیں۔"

…… اور ان لفظوں کے معنی سڑک کی ساری حقیقت کا پتہ دیتے ہیں ــــ سڑک کو

ہٹانے کے لئے بلڈوزر منگوایا جارہا ہے ــــ بلڈوزر آرہا ہے۔ ایک شور مچا ہوا ہے۔ لگتا ہے جیسے سڑک جاگ پڑی ہے ــــ اور جاگتی سڑک کا شور، موسلا دھار پہاڑی ندیوں کا شور، شور...... گلیوں کا شور ــــ "اس سڑک کو اجاڑا نہیں جاسکتا۔ ہم جمہوری ملک کے باسی ہیں۔ سب سے بڑے جمہوری دیش کے۔ یہ سڑک ہماری زندگی ہے۔ ہماری زندگی کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہمیں اجاڑا نہیں جاسکتا۔"

آوازوں کا شور پھیلتا جارہا ہے۔ شور نے کلاکار کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے شور سے اُس کے کان پھٹنے لگے ہیں۔ ان سے لہو رسنے لگا ہے۔ اُس کی آتما بھی لہولہان ہوگئی ہے۔ اور لہو...... قطرہ قطرہ کینوس پر گرنے لگا ہے۔ کینوس تار تار ہوگیا ہے۔ بھیانک شور نے ایزل کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ رنگ بکھر رہے ہیں ــــ اور وہ ایک نیا آدمی...... اکیلا آدمی...... رنگوں کو بکھرتے دیکھ رہا ہے ــــ وہ اپنے آپ کو وہاں سے اُٹھائے چل پڑتا ہے...... وہ چل رہا ہے...... لانبے لانبے ڈگ بھرتے ہوئے۔ اُس کے ساتھ ساری کائنات چل رہی ہے۔ پہاڑ، جنگل، میدان، ہوا، پانی...... سب چل رہے ہیں۔ وہ سب کو پھلانگتا جارہا ہے۔ وہ تھکا نہیں ہے۔ وہ چلتا ہی جارہا ہے ــــ اور آخر چلتے چلتے دور افق پر کانپ رہے ایک نقطہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

کارِجہاں دراز ہے

یاجوج ماجوج کے بسائے ہوئے ملکِ عدن کا دستور تھا کہ جب بادشاہ سلامت سلامتی سے حکومت کرنے کے بعد عدم کو تشریف لے جاتے تو اُن کا جانشین اُسے بنایا جاتا کہ اگلے روز جس کے سر پر سب سے پہلے "ھما" کا سایہ رونق افروز ہوتا۔ بادشاہ کے مرتے ہی ہزاروں لوگ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیتے اور خداوند عزّوجل سے نہایت عاجزی و انکساری سے دُعا کرتے کہ اے دو جہاں کے اصلی مالک و مختار "ھما" کو ہمارے سر پر ڈال تاکہ ہم بھی تیری بخشی ہوئی زمین پر چند روز حکومت کر کے بہارِ باغِ دنیا دیکھ لیں۔ ہزاروں آوازیں خدائی مائیکرو ویو سسٹم کے ذریعہ دو جہاں کے والی تک پہونچتیں۔ یزداں اپنی بنائی ہوئی مخلوق کی تابعداری و محکومی پر خوش ہوتا اور کسی ایک خوش بخت پر اپنی نوازشوں کی بارش کر دیتا۔

ایک بار جب ملکِ عدن کا بادشاہ خاک میں سما گیا تو سبھی باشندگانِ عدن اپنی خوش بختی کے لیے دُعائیں مانگنے لگے۔ ایک بڑے محل کے اندر بیٹھا ایک مالدار تاجر جائے نماز پر

بیٹھا خداوند کریم سے دُعا مانگ رہا تھا۔

"اے اللہ! کل صبح سب سے پہلے ہما کو میرے سر پہ سایہ افگن کر اور مجھے بادشاہ بنا دے۔ اگر ایسا ہوا، تو میں اِس ملک میں امن و سلامتی قائم کروں گا۔ کسی کو تکلیف نہیں دوں گا۔ ہر ایک کے ساتھ انصاف کروں گا۔ ملک کو خوشحال بنا دوں گا۔ قوم کو ہر طرح سے خوش رکھوں گا۔"

یہ سُنکر تاجر کا غلام جو اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اپنے آقا سے کہنے لگا "آقا! اگر جان بخشی ہو تو میں بھی ایک دُعا مانگنا چاہتا ہوں۔" آقا نے جب اجازت دے دی تو اُس نے اپنے ہاتھ دُعا کے لئے اٹھائے اور کہنے لگا۔

"خداوندِ برحق! اگر کل صبح سب سے پہلے ہما میرے سر پہ سایہ ڈال دے اور میں بادشاہ بن جاؤں تو میں قوم پہ اتنا ظلم کروں گا کہ چنگیز و ہلاکو کی روحیں شرما جائیں۔ میری حکومت میں بربریت کا وہ ننگا ناچ ہوگا کہ میرے ملک کی آنے والی سینکڑوں نسلیں میرا نام سن کر کانپ کانپ جایا کریں گی۔ میں ظلم اور عیاشی کو اپنا مقصد بناؤں گا۔ میرے اللہ! میری دُعا قبول کر اور مجھے صرف ایک بار اِس ملک کا بادشاہ بنا دے۔"

——صدقے خدا کی بے نیازی کے کہ اُس نے غلام کی سن لی۔ اگلی صبح ہما کا سایہ اُس کے سرِ مبارک پہ جلوہ نما ہوا اور وہ اُس ملک کا بادشاہ بن گیا۔ بادشاہ بنتے ہی اُس نے اپنے ربِ جلیل سے کئے گئے وعدہ کو نبھایا اور قوم پر وہ ظلم کئے کہ الاماں والحفیظ —— اُس نے پوری قوم کو اُلٹی چھری سے حلال کیا۔ کسی بہو بیٹی کی عزت سلامت نہ رہی۔ بادشاہ کے خلاف ایک لفظ بولنے پر سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔ لوہے کی گرم سلاخیں، کوڑے، جیل اور گولیاں قوم کا نصیب ہو گئیں۔ آخر جب عوام میں قوتِ برداشت نہ رہی تو اُن کے چند نمایندوں نے بادشاہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اُنہوں نے اپنے وفد کی سربراہی کے لئے اُسی تاجر کو چُنا کہ جس کے پاس بادشاہ کبھی غلام ہوا کرتا تھا۔ جب تاجر وفد کو لے کر بادشاہ کے

محل میں پہونچا تو بادشاہ سلامت نے صرف وفد کے سربراہ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا چنانچہ جب تاجر بادشاہ کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ اپنے آقا کو دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ اپنے آقا کی تعظیم میں تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔

"میرے آقا! آپ نے آج کیسے قصرِ شاہی میں آنے کی تکلیف گوارہ کی؟" آقا نے جب عوام کی حالت زار بیان کی اور اسے ظلم بند کرنے کی تلقین کی تو بادشاہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔ "آقا! وہ دن یاد کرو جب میں آپ کا غلام ہوا کرتا تھا۔ ایک دن آپ نے اور میں نے ایک ہی جگہ پر بیٹھے خدا سے الگ الگ دعا کی تھی۔ آقا! آپ نے فرمایا تھا کہ اگر آپ بادشاہ بن گئے تو قوم کا دامن خوشیوں سے بھر دیں گے اور میں نے کہا تھا کہ اگر میں بادشاہ بن گیا تو میں قوم پر اتنے ظلم کروں گا کہ چنگیز و ہلاکو کی سرکش روحیں شرما جائیں۔ آقا! پروردگار نے میری دعا قبول کی تھی آپ کی نہیں۔ لہذا میں تو صرف اپنے خدا سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا ہوں ـــــ اور یہ سن کر آقا اپنا سا مونہہ لے کر قصرِ شاہی سے باہر آ گیا۔

صلیبِ ذات

وہ ایک ننھا بادل..... جو آسمان پر لٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گرجنے لگا۔ اُس کی ہلکی ہلکی آواز میرے کانوں میں پڑنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"جا بھاگ جا یہاں سے۔ یہاں طوفان آنے والا ہے۔ میری جسامت بڑھنے والی ہے۔ میں پھٹنے والا ہوں اور تیری دھرتی پہ تباہی مچانے والا ہوں۔ کیونکہ تیری زمین پر سبھی باون گز کے بن مانس بستے ہیں۔ میں اُن کا قد گھٹانا چاہتا ہوں اور انہیں الگ الگ سائز کے فریجوں میں فٹ کر کے راجہ امبھی کی سمادھی پر لٹکانا چاہتا ہوں ـــــ سنو! یہ رازداری کی بات سنو۔ آؤ..... میرے نزدیک آجاؤ۔ آؤ نا...... لیکن تم میرے پاس کیسے آسکتے ہو۔ تم تو زمین پر ہو..... اور میں ایک بادل..... ہزاروں گیلن بھاری پانی لئے..... آسمان پر لٹک رہا ہوں۔ اچھا چلو! وائرلیس سیٹ کے ذریعہ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ تم وائرلیس سیٹ کا سوئچ آن کردو اور میری بات غور

سے سنو ــــ ہاں تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں بادل بننے سے پہلے تمہاری زمین کا ایک مشہور پلینیٹ تھا ــــ تمہاری زمین میرے محور کے گرد گھومنے لگی تھی۔ تمہاری زمین کے مٹیالے ذرے مجھے دیکھ کر حرارت پکڑنے لگے تھے اور رینگنے لگے تھے۔ میرے وجود نے ان کو ایک ان جانی طاقت بخشی تھی۔ میں ان ذرّوں کو اشرف المخلوقات کی جون میں لانے کے لیے سائنسی تجربے کرنے لگا تھا ــــ چنانچہ میں ایک ایسا انجکشن تیار کرنے میں مگن ہوا جو ذرّوں کے انسانی جون میں آنے کے بعد انہیں اتنی زبردست طاقت بخش دے کہ پھر کوئی ان کی جنس کو تبدیل نہ کر سکے ــــ میرا یہ عمل تمہاری زمین کے اونچے ٹیلوں پر رہنے والے باون گز بیرے بن مانسوں کو ایک آنکھ نہ بھایا ــــ انہوں نے مجھے میری رسدگاہ میں آن دبوچا وہ مجھے گرفتار کر کے لے گئے..... اور مجھے ایک بوسیدہ مکان کے برج پر ٹنگی ہوئی آدم خور عدالت میں پیش کیا۔ مجھ پر فردِ جرم لگائی گئی کہ میں شیطان ہوں۔ کافر ہوں۔ مکار سقراط کا جانشین ہوں اور نظامِ قدرت میں دخل دیتا ہوں ــــ میں نے صحتِ جرم سے انکار کیا۔۔ لیکن میرے انکار سے کیا ہوتا۔ انہوں نے مجھے زہر کا پیالہ دیا۔ پھانسی کا پھندہ دیا۔ میں نے زہر کے پیالے کو چھوڑ کر پھانسی کے پھندے کو گلے لگایا..... اور یوں میں قتل کر دیا گیا ــــ اس روز سورج نہیں نکلا۔ چاند بھی نہیں۔ اس روز تمہاری زمین کی گردش بھی بند رہی۔ چوگرد اندھیرا پھیل گیا..... بہت گہرا، دھواں دار اندھیرا۔ آسمان سیاہ ہو گیا ــــ لیکن کوئی بجلی نہیں کڑکی۔ البتہ آوازوں کا ایک کہرام مچا۔ بھلا بن مانس آوازوں کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ انہوں نے آوازوں کے جنگل میں آگ لگا دی۔ درخت کاٹ ڈالے۔ جنگل سوکھ گیا ــــ اور بظاہر میرا بھو یانی ہو گیا..... لیکن میں فنا نہیں ہوا۔ میں نے بادل کی جون میں جنم لیا اور خود کو آسمان پر ٹکا لیا تاکہ تمہاری زمین کے بن مانسوں پر قہر بن کر نازل ہو سکوں ــــ

پھر موسم بدلا۔ سورج کا تپتا گولہ زمین پر اُتر آیا۔ درختوں کے پتے سُرخ ہو گئے۔ شہر، قصبے دیہات، دریا، مکان، جھونپڑیاں، کھیت، چمنیاں...... سب پر تپتے سورج کا رنگ چھا گیا۔ ذرّوں نے اپنی اپنی چھاتیوں پر کرہ اس کے نشان کھدوا دیئے۔ وہ بھاری صلیبیں اُٹھائے میرے مقتل کے گرد کھڑے ہو گئے۔ اُن کے تپتے چہروں سے آگ ٹپکنے لگی۔ آنکھیں پھیل گئیں اور تیز کرچیں بن گئیں۔...... لیکن کرچیوں کا سفوف بنا دیا گیا——

مگر اب...... اب میں آسمان پر لٹکا ہوا بادل پھیل چکا ہوں۔ میری جسامت بڑھ گئی ہے۔ مجھ میں لاکھوں، کروڑوں گیلن بھاری پانی جمع ہو چکا ہے —— میں پھٹنے والا ہوں اور تمہاری زمین پر تباہی مچانے والا ہوں۔ کیونکہ تیری زمین پر سبھی بادن گزیے بن مانس بستے ہیں میں اُن کا قد گھٹانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا تو بھاگ جا... بھاگ جا..... بھاگ جا...."

آواز پھیلتی ہے اور پھر اچانک کٹ جاتی ہے۔ میں تھرتھراتی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرا وائرلیس سیٹ خراب ہو چکا ہے —— ایک زلزلہ آتا ہے۔ بادل پھٹتا ہے۔ آگ کا دریا بہتا ہے۔ زمین سورج دیوتا سے پناہ مانگتی ہے۔ اور میرے کانوں میں وہ آواز گونج رہی ہے کہ بھاگ جا یہاں سے..... بھاگ جا..... بھاگ جا ..... بھاگ جا —— میں سوچ رہا ہوں کہ زمین سے بھاگ کر کہاں جاؤں۔ شاید پاتال میں۔ لیکن پاتال کے دروازے تو بند ہیں —— اور فرمان ہے کہ پاتال کے دروازے قیامت کے دن کھلیں گے —— پھر..... میں..... کیا کروں..... کہاں جاؤں۔ سوچتا ہوں کیوں نہ بادل کے بھاری پانی میں سما جاؤں...... آگ کے دریا میں غرق ہو جاؤں...... تاکہ...... کسی نئی جون میں جنم لے سکوں...... میں کیا کروں

...... کہاں جاؤں........

بھوشیہ وانی

بھوشی کال میں حالات ایسے ہو گئے کہ مہا پرشوں نے پہلی بار اپنے اُوپر آسمانی قہر نازل ہوتے دیکھا جہاں مہاتما جن رہتے تھے، وہاں ایک طوفان آیا، بڑا بھیانک۔ پتھریلے اولے پڑے اور ریت کی ورشا ہوئی۔ مہا پرشوں کے بھگوان مہاراج ادھیراج کا کہنا تھا کہ آسمانی قہر اُن پر نازل نہیں ہو سکتا۔ اُنہوں نے کہا۔
"ہم تو آسمانی حکم کے تابع رہ کر اس سرشٹی کو چلاتے ہیں ہم تو آسمان کی سب سے پیاری مخلوق ہیں۔ آسمان ہم پر مہربان ہے۔ یہ طوفان کیڑے مکوڑوں کے پر نکلنے کے کارن آیا ہے۔"
پھر طوفان پھیلنے لگا اور مہا پرشوں کو اپنا سب کچھ اُس طوفان میں بہہ جانے کا قطرہ محسوس ہوا شیشوں کے گھر چکنا چور ہونے لگے۔

پھر یوں ہوا کہ سارے مہا پرش طوفان سے بچنے کے لئے بھوشیہ کال سے نکل کر بھوت کال میں آ گئے۔ وہ سارے بھوت کال کی آس میں جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور وادیوں میں سفر کرنے لگے تاکہ اپنے لئے کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈ سکیں اور وہاں پناہ لے سکیں۔ مہا پرشوں کے اس قافلے کی سربراہی بھگوان

ادھیراج آپ شاکھشات کر رہے تھے۔ وہ سارے سونے چاندی کے رتھوں پر سوار تھے...... اپنے دِلدار پریواروں کو ساتھ لئے۔ اُن کے پیچھے سر کھشادل کے ویر جوان پیدل چل رہے تھے، زرہ بکتر پہنے ہاتھوں میں تیر تفنگ، نیزے، بھالے اور برچھے لئے ہوئے۔ تاکہ بھوشیہ کال کے شتروؤں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا سکے اور طوفان کے بھنور سے باہر نکالا جا سکے ـــ کاروان چلتا جا رہا تھا اور بھگوان ادھیراج کی عقابی نظریں پناہ گاہ کی تلاش میں لگی تھیں سفر تھکا دینے والا اور راستہ تکلیف دینے والا تھا۔ ریتلی دھوپ اور سفر کی مشکلوں کے باوجود سارا قافلہ بھگوان ادھیراج کی سربراہی میں ایک ایسے مقام پر جا رُکا جہاں کبیر کے سمے کا ایک اتی سندر اور اتی شر کھشت قلعہ بنا ہوا تھا۔ اُس قلعہ میں کبیر کی ساری دولت دھرتی کے اندر محفوظ پڑی تھی۔ پر قلعے کے دربان کے سینے پر لکھا تھا۔

کاگا کرنگ ڈھونڈ لیا، سگلا کھایا ماس

اے دو نیناں مت چھوئیو پر" دیکھن کی آس

کاروان کے سردار مہاراج ادھیراج نے قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ دربان کی دونوں آنکھیں نکال کر کھا لیں۔ تاکہ پیا دیکھن کی آس سدا کے لئے ختم ہو جائے۔ مہاپُرشوں کا قافلہ بڑی شان سے قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ قلعے میں رہنے والی خلقت کاٹھ کی ہانڈی میں روٹی پکا رہی تھی۔ اور مل کر گا رہی تھی۔

روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ

جنہاں کھادیاں چوپڑیاں گھنے سہن گے دکھ

مہاپُرشوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اُن کا پُر جوش سواگت ہوا۔ مہاپُرش بہت خوش ہوئے ـــ پھر مہاپُرشوں نے سوچا کہ کیوں نہ قلعے کی خلقت کو بھوت کال کے حقیقی

رنگ میں رنگ دیا جائے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ قلعے کی خلقت کو کبھی چوپڑی نہیں کھانے دیں گے۔ اور انہیں گھنے دکھوں میں کبھی گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ ان کی ہڈیوں کا بالن جلا کر کاٹھ کی ہانڈی میں بھوک اُبالیں گے اور انہیں خوب کھلائیں گے ۔۔۔ پھر ایک دن مہاراج ادھیراج نے قلعے کے اندر اُگے ہوئے ایک پہاڑ پر چڑھ کر سب کو اپنے بھگوان ہونے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے خلقت کو بلایا اور کاٹھ کی ہانڈی کی خوبیوں سے بھری ایک پستک قلعے کی خلقت کو بخشی۔ سبھی مہا پرشوں نے مل کر اس پستک کو مہاراج ادھیراج کی شبھ وانی کا روپ دیا۔ وہ شبھ وانی ساری خلقت نے زبانی یاد کر لی۔ جلد ہی پستک کی تاثیر نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ قلعے کی ساری خلقت کاٹھ کی ہانڈی کی شردھالو بن گئی۔ وہ لوگ کاٹھ کی ہانڈی کی مورتیاں بنا کر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر گئے۔ مہاراج ادھیراج اور سبھی مہا پرش اُن کے ارپن کئے ہوئے شردھا کے پھولوں کو اپنی جھولیوں میں ڈالتے رہے۔ کبیر کی دولت کے خزانے دھرتی کے اندر زیادہ محفوظ ہوتے گئے۔ خزانوں کی مالکی مختاری اور سرداری مہا پرشوں کا مقدر بن گئی اور .... شردھا، وفاداری اور تابعداری قلعے کی خلقت کا فرض قرار دے دی گئی ۔۔۔

مہا پرشوں کی دیا درشٹی سے قلعے کی دیواریں اُونچی اور پکی ہو چکی ہیں۔ اب مہا پرشوں کو قلعے پر کسی شترو کے حملہ کا ڈر نہیں رہا۔ کسی طوفان کا کھٹکا نہیں رہا۔ اب کسی سیلاب میں بہہ جانے کا خدشہ نہیں رہا۔ خلقت کاٹھ کی ہانڈی کی پجاری ہے ۔۔۔ مہا پرش بے خوف ہو کر .... قلعے کے اندر بڑی عزت اور عاجزی سے شیشوں کے گھر بنا رہے ہیں۔ مہا پرشوں کے بھگوان مہاراج ادھیراج کا فرمان ہے کہ انہوں نے سمے کو اپنی مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ وقت کی گردن مروڑ دی ہے۔ وقت اُن کا قیدی ہے۔ اب دوبارہ بھوشیہ کال کبھی نہیں آ سکتا ۔۔۔

قلعے کی ساری خلقت مہاراج ادھیراج کی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتی ہے۔ اور پراچین کال کے دستور کے مطابق وہ ہر روز مہا پرشوں کے ہر حکم کے آگے سیس جھکاتے ہیں۔ سبھی خوش ہیں۔ کیونکہ سرشٹی چل رہی ہے۔

اندھیر نگری

میں ایک سادہ لوح بندہ تھا۔ میرا پیشہ اِس آزاد سمندر میں موتی تلاش کرنا تھا۔ میں عرصہ دراز سے موتیوں کی جستجو میں اِس گہرے سمندر میں غوطے لگاتا رہا اور ہر بار موتیوں کے بدلے سیپ ہی پاتا رہا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں اپنی آرزو کی تکمیل میں سمندر کو کھنگالتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے جنون میں کامیاب ہو جاؤں گا — لیکن میں ناکام رہا — میں نے اِس سمندر میں بڑی بڑی چٹانوں پر سیپوں کو بیٹھے دیکھا جو الفاظ کے پیکر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ موتی ہیں — میں نے اُن کو پرکھنا چاہا۔ چنانچہ ایک پہاڑ نما چٹان پر بیٹھے قوی ہیکل سیپ کو میں نے سونے اور چاندی کی کوٹھالی میں پگھلایا۔ پگھلے ہوئے مادے میں میں نے لاکھوں مری ہوئی مچھلیاں دیکھیں جو اس قوی ہیکل سیپ نے ہضم کر رکھی تھیں۔ اُن مری ہوئی مچھلیوں سے کہا گیا تھا کہ انہیں زندہ جاوید کر دیا جائے گا اور آزادی سے سمندر میں تیرنے دیا جائے گا مگر آزاد سمندر کا سارا پانی قوی ہیکل سیپ

کے اندر دفن ہو چکا تھا اور اب وہاں صرف ایک صحرا تھا کہ جس کی چمکتی ریت ..... مری ہوئی مچھلیوں کے پیٹ میں پلاسٹک سرجری کے ذریعہ بھر دی گئی تھی ــــ میں نے ایک اور سیپ کو برفانی تودے پر بیٹھے دیکھا جو لاشوں کا سر قلم کر کے سروں کے خول میں دِل خوش آوازیں بھرتا جاتا ..... اور پھر سروں کو دھڑوں کے ساتھ جوڑتا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سبھی آوازیں سیپ کے موتی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں اور اُس کے شاندار کارناموں کا قصیدہ پڑھ رہی تھیں ــــ میں نے ایک ایسے جادوبیاں سیپ کا بھی نظارا کیا کہ جس نے اپنے کالے جادو کی گرمی سے ہوا کا چلنا بند کر دیا تھا۔ دریاؤں کا بہنا، پرندوں کا اُڑنا، پھولوں کا کھِلنا، ندیوں کا مچلنا ..... سب بند کر دیا تھا اُس نے۔ پھر بھی پرند، چرند، دریا، ندی نالے، ہوا، پھول، پتے خوش تھے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی سیپ کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اُتارنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے ــــ میں نے ایک ایسا سیپ بھی دیکھا ..... جو ہمیشہ اپنے دونوں ہاتھ وسیع آسمان کی طرف پھیلائے رکھتا اور خدائے برحق سے ہمکلام ہونے کا ڈھونگ رچاتا۔ حقیقت میں وہ اپنے نفس کے پروردگار کو خوش کرتا۔ وہ اپنے علم کے فریب سے چڑیوں کی چہچہاہٹ کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کی سعی کرتا رہتا۔ بلبلوں کو فریب دیتا رہتا ــــ میں نے اور بھی اَن گنت سیپ دیکھے جو اِصواۓ کربے کراں میں اپنی دکان سجائے بیٹھے تھے، اور اپنے مال کو موتی ثابت کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آزاد سمندر کے باسی اِن سیپوں کو موتی تسلیم کرتے تھے۔ جب میں نے اُن پر سیپوں کی حقیقت واضع کرنا چاہی تو چاروں طرف سے آوازوں کا ایک شور گونجا کہ یہ سیپ اصلی موتی ہیں۔ آوازوں کے اِس بے پناہ شور میں مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ میں نے سمندر سے معافی مانگی اور آخرکار اُن کی بات پر ایمان لایا ..... کہ یہ سیپ ہی اصل موتی ہیں ــــ کیونکہ میرے الفاظ اُس شور میں اپنے معنی کھو چکے تھے۔

نوٹ :۔ اِس افسانہ کے مزاج کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سیپ کو دانستہ طور میں نے مذکر باندھا ہے۔

راج سنگھاسن ڈانواں ڈول

برہم لوک کا پرجا تنتری ریتی رواج یہ تھا کہ وہاں کے پردھان کا دھانت ہوتے ہی پرجا کے پرتی ندھیوں کی ایک بیٹھک بلائی جاتی جو نئے پردھان کا چناؤ کرتی ۔۔۔ پرنتو ایک بار جب برہم لوک کے پردھان کا دھانت ہوا تو وہاں کی پرجا کے پرتی ندھی نیا پردھان چننے میں اسپھل رہے۔ اُن کی نظر میں کوئی نیتا جچا ہی نہیں۔ راج سنگھاسن خالی رہنے کے کارن جب ڈانواں ڈول ہونے لگا تو پرجا کے پرتی ندھیوں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح برہم لوک کی سرحد کے اندر جو پہلا منش داخل ہوگا، اسے راج سنگھاسن پر بیٹھا دیا جائے اور اس طرح پرجا کی رہنمائی کا فیصلہ دیش کے راشی پھل پر چھوڑ دیا جائے ۔۔۔ دوسری صبح برہم لوک کی سرحد کے اندر جو پہلا منش داخل ہوا، وہ ایک سادھو تھا۔ بھگوے رنگ کا کرتہ، کھدر کی ٹوپی اور ململ کی لنگوٹی پہنے اور ہاتھ میں پیتل کا لوٹا لیئے۔ پرجا کے پرتی ندھیوں نے اُس کا روایتی انداز سے ہاردِک سواگت کیا اور اُسے برہم لوک کے راج سنگھاسن پر بیٹھا دیا۔ یوں سادھو مہاراج برہم لوک کے نئے پردھان بن گئے۔

پردھان بنتے ہی اُنہوں نے ڈھول پٹوایا کہ وہ ہزاروں ورش پُرانی سبھیتا کے علمبردار ہیں۔ اِس لئے وہ دیش کو پراچین کال کے حقیقی رنگوں میں رنگ دیں گے اور دیش کو ستیم شیوم سندرم بنا دیں گے لیکن راج محل میں آتے ہی اُن کے لوٹے کی دھات سونے میں تبدیل ہوگئی اور لنگوٹی کی ململ ریشم میں۔ اُن کے لہو کا رنگ کالا ہوگیا۔ اُن کے لمبے کان بہرے ہوگئے۔ اُن کی موٹی آنکھیں چُندھیا گئیں، اور آنکھوں نے راج محل سے باہر جھانکنا بند کر دیا ـــــ پرجا کے پرتی ندھی نئے پردھان کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ پرجا بہرے پردھان کو دیکھ کر اُلجھن میں پڑ گئی اور بے چین ہوگئی ـــــ برہم لوک میں ایک ہاہاکار مچ گئی..... لیکن ہاہاکار کا شور راج محل کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر بکھر جاتا۔ کارن یہ تھا کہ راج محل کی دیواریں لوہے کی بنی تھیں اور لوہا بہرے کانوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ دیش کی یہ دِشا دیکھ کر چور اُچکے چودھری بن گئے۔ پرجا کی شانتی بھنگ ہوگئی۔ پرنتو سادھو مہاراج کا فرمان تھا کہ اُن کا راج..... اہنسا پرمو دھرما کی مُونہہ بولتی تصویر ہے ـــــ

پرجا کی بے چینی اور اُن کے پرتی ندھیوں کی دکھی حالت کا پتہ جب شُترو کو چلا تو اُس نے برہم لوک پر قبضہ کرنے کے لئے ایک بڑی فوج کو ساتھ لے کر راج محل پر حملہ کر دیا۔ شُترو کی فوج نے راج محل کی فولادی دیواروں کو اگن بان توپوں سے اُڑا دیا۔ جب پرجا کے پرتی ندھیوں نے برہم لوک کے پردھان کو حالات سے آگاہ کیا تو اُنہوں نے اِس اور کوئی دھیان نہیں دیا۔ فولادی دیواروں کے گرتے ہی جب شُترو اپنی فوج کے ساتھ راج محل میں داخل ہوا تو پرجا کے پرتی ندھی پھر اپنے پردھان کے پاس آئے اور تازہ ستھتی کی جانکاری دینے لگے۔ لیکن بہرے پردھان کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ اُنہوں نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ رام بھلی کریں گے۔ جب شُترو سادھو مہاراج کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو پرجا کے پرتی ندھی ایک بار پھر اُن کے پاس گئے اور شُترو کے راج سنگھاسن پر قبضہ کرنے سے متعلق بتانے لگے ـــــ سادھو مہاراج کے بہرے کان ایک دم چونک پڑے اور وہ آوازوں کو سننے لگے۔ اُن کی رگوں میں دوڑ رہا کالا لہو اپنے اصلی رنگ میں آگیا۔ اُنہوں نے پرجا کے پرتی ندھیوں سے اپنا پیتل کا لوٹا مانگا کہ جس پر سونے کا رنگ چڑھ آیا تھا۔ اُنہوں نے

مدّ و جزر

بی بی

یہ بہت پرانی بات ہے کہ یزداں کی بنائی ہوئی اِس میڈیم سائز دنیا میں جمشید کی جنت کی طرح خوبصورت ایک خطہ اُراضی دیوہیکل پہاڑوں کی گود میں لٹکا ہوا تھا۔ وہاں پر بسنے والی معصوم بھولی بھالی مخلوق اپنے بانکے سجیلے، علم و حکمت سے مالا مال اور با عمل رہنما کے سکھانے پر اُس دلکش اراضی کو خود مختار ملک کا نام دیتی تھی۔ اِسی ملک کو ایک بار پہاڑی دّرّوں کے اُس پار سے وارد ہوئے حملہ آور راکھشسوں نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ اور باغِ بہشت کی معصوم مخلوق کو ایک قلعہ میں بند کر دیا۔۔۔ اُس ملک کے عوام کو غلامی سے نجات دِلانے کے لئے بانکے سجیلے لیڈر نے بھرپور جدوجہد کیا۔ اُس نے عوام کو غاصبوں کے خلاف اُکسایا۔ انہیں سمجھایا کہ آزادی اِنسان کا پیدائشی حق ہے۔ لہٰذا آزادی کا پُرلذت پھل حاصل کرنے کے لیے دُشمن پر شیر اور چیتے کی طرح ٹوٹ پڑو۔ لیکن اُس ملک کے عوام گولی لاٹھی اور کوڑوں کی مار سے اتنے دہشت زدہ تھے کہ کسی نے اُس کی بات پر توجہ نہ دی بلکہ اُلٹا

کر لیڈر موصوف نے اپنے آپ کو راکھشسوں کے حوالے کر دیا کہ جن کی سرداری عوام نے تسلیم کر لی
تھی اور وصیّت کر دی کہ وہ اپنی قوم سے مایوس ہو چکا ہے، اس لئے وہ مرنا چاہتا ہے
لیکن وہ چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد اُس کی لاش کو غلام سرزمین میں نہ دفنایا جائے بلکہ بحیرۂ
عرب کی موجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس دردبھری وصیّت سے راکھشسوں کا سربراہ اتنا
متاثر ہوا کہ اُس نے اُس چھوٹے سے خطۂ اراضی کو اپنی مملکت کی حدود میں شامل کرنے
کے بعد اُس کا اندرونی انتظام اُسی لیڈر کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اقتدار و انتظام سنبھالتے
ہی عظیم رہنما کے خاص پیروکاروں نے وہ اندھیر گردی مچائی کہ ساری قوم میں ہاہاکار مچ گئی۔
— چرند پرند، پشو، جانور سب گونگے ہو گئے۔ جب تمناؤں کا بستا شہر اُجڑ گیا اور ذہن و
دل کے لہلہاتے کھیت بنجر ہوئے تو قوم کا ایک وفد اپنے محبوب لیڈر سے ملاقی ہوا اور عرض
کیا "اے آقائے ملک و قوم! — ہم عزّت و آبرو حاصل کرنے کے لئے بتائے گئے اصولوں
اور دیگر رائج الوقت رسم و رواجوں سے اتنے کرب زدہ اور نڈھال ہو چکے ہیں کہ اب مرا ہی چاہتے
ہیں۔ لہذا آپ سے گزارش ہے کہ بعد از مرگ اپنی بدنصیب قوم کو بحیرۂ عرب میں بہا دیں تاکہ
آپ کا ستارہ بلند سے بلند تر رہے —" اور پھر..... روایت ہے کہ وہ قوم بحیرۂ عرب
کی موجوں میں بہا دی گئی۔

دیواروں میں چھپی واسنا

ہر شخص دیواروں کا محتاج ہے۔ دیواریں...... تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لئے...... کمپلیکس کے سرائیوں میں حفاظت سے اُڑان بھرنے کے لئے۔ دیواریں، مقصد پورا ہونے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لئے...... اور دیواریں...... بہار رُت کو گونگی اور اندھی خزاں سے بچانے کے لئے...... دیواریں...... شبنم کے قطروں کے بچاؤ کے لئے جو ہاتھ لگتے ہی اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتے ہیں ــــ اگر بہار رُت کو دیوار کا سہارا نہ ملے تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو آج اُس عورت کا ہے جس کے بے حس جسم کو کوؤں نے بُری طرح نوچ ڈالا ہے۔ اُس نے بڑی مشکل سے کوؤں کو اپنے جسم سے اُڑایا ہے۔ لیکن کوئے پھر کوتے ہیں، وہ لاوارث جسم کو دیکھ کر چیلوں اور گدھوں کو بھی دعوتِ طعام دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت بھی ایک دیوار کی محتاج ہے۔ بہت زیادہ محتاج ــــ فطرت یزداں کی طرف سے

انسان کے لئے بخشش ہے۔۔۔ اسی لئے فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ گوشت کو نوچنا۔۔۔ کوؤں کی فطرت ہے اور جیولر کی خواہش کرنا ہر عورت کی فطرت۔ اماں حوا کے سفر سے لے کر اس عورت کے سفر تک اس فطرت کی کرم فرمائی کی کئی کڑیاں ہیں۔ ان کڑیوں میں اُلجھ کر وہ عورت بھی مرادوں کی منزل سے کوسوں دور رہی ہے۔ پنچ تنتر میں ہے۔

"ایک خونخوار شیر بوڑھا ہونے پر گلے میں مالا ڈال کر پرہیزگار بن گیا اور جنگل کے ایک کونے میں بیٹھ کر پرماتما کی عبادت کرنے لگا۔ جب کوئی اکیلا دکیلا جانور شیر کے نیاز حاصل کرتے آتا تو وہ اسے ایک ہی جھپٹے میں ہلاک کر کے اپنا نوالہ بنا ڈالتا۔ ایک دفعہ ایک بلی نے شیر کے ڈھونگ کا ہر پردہ فاش کر دیا۔ وہ گھومتی گھامتی اُدھر سے گزری کہ اچانک اُسے ایک کنوئیں سے ہڈیوں کی بو آئی۔ اُس نے جب کنوئیں میں جھانکا تو اُسے شیر کی کرتوت کا پتہ چل گیا۔"

یہ قصہ تو بہت پُرانا ہے لیکن الفاظ تر و تازہ ہیں۔ ان میں صدیوں پُرانے لباس کی باس نہیں ہے۔ پرہیزگاری کی آڑ میں بوڑھے شیر آج بھی شکار کھیلتے ہیں۔ اور وہ عمر رسیدہ فنکار۔۔۔ جس نے اُس عورت کو سب سے پہلے شکار بنانے کے لئے اپنے فنکارانہ ترکش سے منقش تیر پھینکا تو وہ سیدھا اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔ ہونہار ہو۔ قابل ہو۔ ہر موضوع پر کھل کر بات کر سکتی ہو۔ تمہارا مطالعہ وسیع ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں اس چیز کی بہت کمی ہے۔ خاصکر لڑکیوں میں۔ بی اے۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتے ہوئے بھی موجودہ نسل صحیح ڈھنگ سے گفتگو نہیں کر سکتی۔ کسی بھی موضوع پر بات کریں۔ آپ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو کورا ہی پائیں گے ۔۔۔ ایسے ماحول میں تم جیسی لڑکی کو دیکھ کر بہت خوشی

ہوتی ہے۔ یہ تمہاری قابلیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج اعلیٰ سرکاری عہدہ پر براجمان ہو۔"

"جی شکریہ!" دراصل اس میں ماحول کا بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے والد ملک کے مشہور وکیل تھے۔ انہیں ادب، فلسفہ اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔ میں بچپن سے ہی..... درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی پڑھ لیا کرتی تھی جو میرے والد پڑھنے کے لیئے لاتے تھے۔ اُن کی ذاتی لائبریری میں دو ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ میرے بھائی ایک مشہور انجینئر ہیں۔ ملک کی دشوار گزار سڑکیں اُنہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک ماہر آرٹیکیٹ ہیں۔ ہمارے شہر کی فلک بوس عمارتوں میں سے کم از کم ایک چوتھائی کے نقشے انہوں نے بنائے ہیں ــــ مجھے تاریخ اور فلسفے سے بے حد دلچسپی ہے....."

وہ باتیں کر رہی ہے..... بوڑھے فنکار کی ماہر نظریں اُس کے جسم کے ایک ایک زاویے کو ٹٹول رہی ہیں۔ اُس کی آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی بھوک، تڑپ، آرزو..... پلکوں پہ آجاتی ہے اور کبھی کبھی پلکوں سے باہر بھی جھانک لیتی ہے۔

"اس سرکاری عہدہ پہ میں میرٹ کی وجہ سے آئی ہوں۔ میں نے کمپٹیشن میں حصّہ لیا اور ٹاپ کیا ــــ باقی آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ ہاں! آپ کے بیٹے کا کیس منظوری کے لئے بھیجا ہے۔ ہم نے سفارش کر دی ہے کہ آپ کا بیٹا آنتوں کا ماہر ڈاکٹر ہے اور مزید تعلیم کے لئے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اُس کی خواہش کو دبانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اُسے جانے کی اجازت دے دینی چاہیئے تاکہ واپس آنے کے بعد وہ اپنے دیش واسیوں کی بہتر سیوا کر سکے ــــ"

مس نازیہ! اس سے ملو۔ یہ میرا بیٹا ہے ڈاکٹر مندال حیدر۔ کل اِس کا جنم دن ہے ہم تمہیں انوائیٹ کرنے آئے ہیں۔ کل رات تم ڈنر ہمارے ہاں ہی لوگی۔ میں نے اپنے گھر کا ایڈریس تو تمہیں بتا ہی دیا ہے۔

"لیکن........."

"لیکن وکین کچھ نہیں، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں نے اپنے بیٹے سے تمہارا کئی بار ذکر کیا ہے یہ بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔ اس لئے یہ بھی ساتھ چلا آیا ___ اسی طرح تعلقات بڑھتے ہیں۔ ہاں! تم اپنے بڑے بھائی انجینئر صاحب کو بھی ساتھ لیتی آنا۔"

تعلقات بڑھتے گئے۔ آخر ایک دن بوڑھے فنکار کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانہ پر جا لگا۔

"مس نازیہ! ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ کے لئے ہمارے قریب آجاؤ۔ میرا بیٹا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔ دل و جان سے چاہتا ہے۔ میری پسند بھی صرف تم ہی ہو ___ تم اس سے کئی بار مل چکی ہو۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ امریکہ جانے سے قبل ہی شادی کرے ___ " تمہاری مرضی کیا ہے۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اس معاملہ میں آپ میرے بھیا سے بات کر لیں!"

___ مس نازیہ ...... مسز نازیہ منڈل حیدر بن گئی۔ بوڑھا فنکار بے حد خوش ہے اس میں نئی جوانی آگئی ہے۔ اس کے اندر جذب ہو چکی شوخیوں کو پر لگ گئے ہیں اور چمن پنجرے میں پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔ وہ ہر رات کو نازیہ اور حیدر کے بیڈروم میں جھانکتا رہتا ہے۔ ان سوراخوں سے جو دکھائی نہیں دیتے ___ نازیہ اور حیدر اس کے لئے تسکین کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ نازیہ کے جسم کے زاویوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہے اور پھر اپنے بدن کا بوجھ لے کر بیڈروم میں آجاتا ہے اور اپنے بستر کے پھیکے سفر پر گامزن ہو کر کروٹیں بدلتا رہتا ہے ___ اب ہر روز اس کے تن کے صحرا میں بگولے اٹھتے ہیں جنہیں ہر رات وہ راکھ میں ٹھنڈا کرتا ہے۔

___ پھر ڈاکٹر منڈل حیدر مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا اور نازیہ اپنے دفتر کے بعد گھر میں بوڑھے فنکار کے ساتھ رہنے لگی۔ اور پھر ایک رات ..... نازیہ کے تپتے بیساکھ کو بوڑھا فنکار اپنے واسنا سے بھرے بن باس میں اٹھا کر لے گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں اور اپنی باہوں میں چاند کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ پر چاند اس کی انگلیوں سے پھسل جاتا۔ بار بار کی پھسلن

سے چاند نیچے گر گیا۔ اور بوڑھے فنکار کی مٹھی میں آگیا ـــــ وہ بولا" وہ مکان جس کی چھت پر برف پڑی ہو اُس کے اندر بھی آگ جلتی ہے۔"

بستر کے پھیکے سفر کی یاترا سپھل ہوئی۔ الاؤ روشن ہوا اور پھر اندھے کنویں میں جا کر بکھر گیا ـــــ اُس کے سلگتے جسم کو آنکھوں کا ساون رِم جھم سے ٹھنڈا کرنے لگا۔ اور پھر اُس نے بوڑھے فنکار کے مہذب ڈرائنگ روم سے نکل کر بار روم تک جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی پھر بھی وہ سلگتی رہی۔ اُبلتی رہی اور بکھرتی رہی ـــــ بوڑھا فنکار کسی اور تصویر کو مکمل کرنے میں مگن ہو گیا اور نازیہ جلتی تنہائی کو آتے جاتے موسموں میں گم کرنے لگی لیکن سورج چاند ستارے پی جانے کے بعد بھی وہ پیاسی رہی ـــــ بوڑھے فنکار نے اُسے بدچلنی کے گھوڑے پر سوار کر کے اپنے گھر سے روانہ کر دیا ـــــ نازیہ روایت سے نہیں ٹکرائی۔ اُس نے سماج کی فضول رسموں کو بالائے طاق رکھ کر سلگتی ویرانی کو اپنا نشیمن بنا لیا ـــــ اور پھر...... اُس کے نشیمن پر آئے دن بگولے حملہ کرتے رہتے۔ وہ ہر حملہ سہتی رہتی۔ دُکھ ایک پل کا بھی ہو تو عمروں لمبا ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ طویل ہو تب یگوں میں پھیلنے لگتا ہے۔ یگوں میں پھیلے درد کے دریا کی لہروں کو شانت کرنے کے لئے وہ ایک دیوار کا سہارا ڈھونڈنے لگی تا کہ وہ قلعہ بند ہو جائے اور ہزاروں ہا منروں والے اور بے شمار ستم صیادوں سے بس آسیب پل پل اُس کا پیچھا نہ کر سکیں۔ لیکن اُسے ہر بار کچی دیواروں سے ہی واسطہ پڑتا جو مقصد پورا ہونے کے بعد ہی گر جاتیں ـــــ اور...... اُس کے نشیمن کے صحن میں پھر سے رستے بننے لگتے۔ ایک پائیدار دیوار کی خواہش میں وہ آج بھی بھٹک رہی ہے تن کا صحرا لئے۔ اور اِس صحرا کے لئے دکھائی دینے والا ہر نخلستان ایک سراب ہے۔

آہ وزاریاں

جو بھی مائی جاناں سے پوچھتا "بہن! بہو کیسی ہے؟" ـــ وہ اُسے ٹالنے والا جواب دیتی۔
"ابھی تک تو اچھی بھلی ہے۔ آگے کا پتہ نہیں۔"
کبھی کبھار پاس پڑوس کی کوئی بوڑھی اُس کے ساتھ اپنی بہو کا دکھڑا رونے بیٹھتی
تو وہ اُسے ایک ہی جواب دیتی۔
"بہو بھی جبھی اچھی ہوتی ہے جب اپنا بیٹا اچھا ہو۔"
"ہاں بہن! تمہارے تو بھاگ اچھے ہیں۔ بہو بھی اچھی ملی ہے اور بیٹا بھی نیک و تابعدار۔"
مائی جاناں کی بہو سلیمہ اچھی کیوں نہ ہوتی۔ اُس نے تو آتے ہی اپنے ہاتھوں کی مہندی اور آنکھوں کا کاجل اِس گھر کے چولہے میں جلا دیا تھا۔ مائی جاناں کی لاڈلی بیٹی تو گھر کے کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھی ـــ بہو کے آنے سے پہلے گھر کا سارا کام مائی جاناں کو خود کرنا پڑتا تھا ـــ چولہا چوکا سنبھالنا، پانی بھرنا، گھر کی صفائی، کپڑے دھونا،

برتن صاف کرنا، جھاڑو دینا...... کیا کیا مصیبت جھیلنی نہیں پڑتی تھی ___ لیکن جب سے نازک اندام سلیمہ..... کیسی جنتی کار دیپ دھاک کے اِس گھر میں آئی تھی گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا ___ دھوپ نکلتے ہی مائی جاناں کی چارپائی باہر آنگن میں بچھ جاتی۔ سارا دن وہ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پیتی رہتی..... سلیمہ پر حکم چلاتی رہتی ___ دن بھر کام کرنے کے بعد تھکاوٹ سے چور.... رات کو جب سلیمہ اپنے کمرے میں آتی تو ادھ مری سی پلنگ پر گر پڑتی۔ پر وہاں بھی اُسے آرام کم ہی نصیب ہوتا ___

"اے جی! آج مجھے سخت سر درد ہو رہا ہے۔ آج مجھ سے کام نہیں ہو سکے گا۔"

"تم ماں سے کہنا۔ وہ خود خالدہ سے کام کروا لے گی۔"

"اماں جی! آج میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا۔"

"تو جاؤ، تم جا کر آرام کرو۔ ہم خود کام کر لیں گے۔ یہاں کام ہی کتنا ہوتا ہے ___ آج کی بہوئیں.... کام کرنے کو جی نہیں کرتا۔ کبھی سر درد کا بہانہ لے بیٹھتی ہیں اور کبھی پیٹ درد کا ___ ایک ہمارا بھی زمانہ تھا۔ کیا مجال تھی کہ بہو ساس سسر کے سامنے منہ کھولتی ___ اب تو زمانے کو ہی آگ لگ گئی ہے" ___ اور بیچاری سلیمہ پھر کام میں جُٹ گئی۔

___ "اے جی! میری ماں کہتی ہے کہ ان دنوں زیادہ بھاری کام نہیں کیا کرتے۔"

"تو میں کیا کروں۔ تم خود ماں سے کیوں نہیں کہتی ہو۔ وہ تمہاری بھی تو ماں ہے۔"

"آپ ہی کہہ دیں نا۔ اماں جی آپ کی بات مان لیتی ہیں۔"

"ماں جی! ماں جی۔" ___ "کیا بات ہے بیٹا۔"

"آج کل سلیمہ کو بھاری کام نہ کرنے دیا کریں۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

"اچھا بیٹا" ___ "کیسا بُرا زمانہ آگیا ہے۔ آج کل بیویاں..... خاوندوں کی آڑ میں شکار کھیلتی ہیں ___ توبہ! توبہ! ایسی بے شرمی ہمارے زمانے میں تو نہیں تھی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ

میل سے پانی لانا پڑتا تھا۔ خدا کے فضل سے چھ چھ بچے جنے۔ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ آج تو گھر گھر نلکے لگے ہیں۔ پھر بھی پانی کی بالٹی سے ڈر لگتا ہے ـــ خالدہ! او خالدہ..... کہاں مر گئی تو..... جانل سے پانی کا گھڑا بھر لا۔ سلیمہ بیچاری بھاری کام نہیں کر سکتی" ـــ پھر مائی جاناں کے گھر شہنائیاں بجنے لگیں۔ بھانڈ اور ہیجڑے ناچنے لگے۔ دوہری خوشی پر ـــ خالدہ کی شادی اور پوتا پیدا ہونے کی خوشی پر۔

ـــ "اٹھ سلیمہ اٹھ۔ چھوڑ اب بستر کو۔ ہم تو بچہ پیدا ہوتے کے پانچویں دن ہی کام کاج کرنے لگ پڑتے تھے۔ تمہیں تو اب دس دن ہو گئے ہیں..... پلنگ پہ لیٹے" ـــ اور سلیمہ کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کام میں پھر مصروف ہو گئی ـــ کچھ عرصہ بعد جب خالدہ میکے آئی تو اس کا پاؤں بھاری تھا۔ ایک دن جب نہانے کے لئے وہ پانی کی بالٹی غسل خانہ میں لے جانے لگی تو مائی جاناں دوڑتی ہوئی آئی ـــ "ارے تجھے کہنا تھا۔ میں کیا مر گئی تھی بیوقوف! تجھے پتہ نہیں ان دنوں بھاری کام نہیں کیا کرتے" ـــ اور سلیمہ کی نظریں مائی جاناں کے چہرے پر اٹک گئیں ـــ مائی جاناں..... سلیمہ..... خالدہ ـــ ایک ساس.... ایک بہو..... ایک بیٹی ـــ پھر وہ نظریں آکاش میں کچھ ڈھونڈنے لگیں ـــ

دشمن کون

"ہنس کے لیا تھا پاکستان، لڑ کے لیں گے ہندوستان"

"چاہے مار دو اپنی جان، مِٹ کے رہے گا پاکستان"

"اگر بھارت نے ہمارے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کی جرأت کی تو ہم بھرپور لڑائی چھیڑ دیں گے۔ پاک فوج کے شیر جوان ... دشمن کو مٹانے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔"

"اگر پاکستان نے بھارت کے ساتھ جنگ چھیڑنے کی حماقت کی تو یہ اُس کے گھر میں لڑی جائے گی اور اُسے تباہ و برباد کر دیا جائے گا" ۔۔۔ لیڈروں کے یہ بیان .... آج کل پاک اور بھارت کے ریڈیو اور اخباروں کی بڑی سرخیاں بن گئے ہیں۔ لیڈروں کے اِن بھاشنوں سے دونوں جانب جنگی جنون پھیل چکا ہے۔ جہاں جائیے ...... جنگ کی ہی باتیں سنائی دیں گی۔ ہماری فوجیں دشمن کی فوجوں کے مقابل کھڑی ہیں۔ سرحدی دیہات خالی کرائے جا رہے ہیں۔ بلیک آوٹ کی مشقیں کی جا رہی ہیں۔

ملک کا بچہ بچہ دشمن کو مٹانے کی قسم کھا رہا ہے۔

—— آج دیوالی کا دن ہے۔ ہم والنٹر کور کے کچھ ساتھی مٹھائی بانٹنے بارڈر پر گئے ہوئے ہیں.... گرڑ کھال جکر دبی اور مرٹھن کی سرحدی چوکیوں سے ہوتے ہوئے ہم سچیت گڈھ پہنچے۔ ہم نے دیکھا ہماری پوسٹ سے دشمن کی چوکی کچھ سو فٹ کی دوری پر ہے۔ اور سرحدی حفاظتی پولیس کے جوانوں کے بالکل سامنے سٹین گن کے سپاہی کھڑے ہیں۔

—— چوکی کا انچارج ہمارے سوالات کا جواب دے رہا تھا کہ......

"اوہ کافرا...... او بے کافرا...." پار سے کسی نے آواز دی۔

"آج دیوالی ہے۔ مٹھائی نہیں کھلاؤ گے؟"

"او بے مسلے.... تم لوگوں نے ہمیں مٹھائی کھلانے کے قابل رکھا ہی کہاں ہے تمہارے فوجی حاکم تو آئے دن لڑائی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"رہنے دو یار، رہنے دو۔ کم کوئی بھی نہیں کر رہا بھئی۔ باقی ہم تو ٹھہرے حکم کے غلام۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو.... ہمیں مٹھائی کھلانے ہو یا نہیں...." اور وہ ہنس پڑا۔

"ہاں بھائی! کیوں نہیں کھلائیں گے۔ ابھی منگواتے ہیں۔"

"ہاں دیکھو یار.... کیلے ضرور منگوا لینا۔" وہ اپنی چوکی کی طرف جاتے ہوئے بولا

"صوبے دار صاحب! یہ کون تھا؟" میں نے چوکی افسر سے پوچھا۔

"دوست! یہ پاکستانی چوکی کا انچارج ہے۔ بٹوارے سے پہلے ہم ایک ہی گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ بہت پیارا شخص ہے۔ اپنا یار بیلی ہے۔ ہر عید کو ہمیں مٹھائی اور کینو کھلاتا ہے۔ آج کل ذرا سختی ہو گئی ہے۔ ورنہ ہم اکھٹے والی بال بھی کھیلتے ہیں۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چوکی انچارج نے سپاہیوں سے دو دو روپے چندہ اکٹھا کیا اور ایک سپاہی کو کیلے اور مٹھائی خریدنے شہر بھیج دیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد وہ سپاہی شہر سے واپس آ گیا۔

"اُدیے مختارے! آؤ بھی آؤ! مٹھائی کھالو۔" "کیا لے آئے ہو مٹھائی۔"؟

"ہاں ہاں! لیکن میں خود بانٹوں گا۔"

"نہیں رچھپال ے۔ ایسا ممکن نہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ آج کل سخت آرڈر ہیں پر تم کیلے اور مٹھائی گیٹ تک لے کے آسکتے ہو۔"

رچھپال مٹھائی اور کیلوں سے لدی ہوئی ٹوکری لے کر گیٹ تک گیا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے گلے ملے۔ میں نے دیکھا کہ وہ نہیں مل رہے تھے۔ بلکہ اُن کی تہذیب گلے مل رہی تھی۔ اُن کے دِل گلے مِل رہے تھے۔ وہ دِل جو ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں سے راوی اور چناب بہنے لگے۔ مختارے نے بھی کِنوؤں کا ٹوکرا رچھپال کو دیا۔ اور پھر دونوں اپنے اپنے ملک کی سرحد کے اندر آ گئے۔ اس سرحد کے اندر۔ جہاں سے بہت دور..... شہروں میں لیڈر دشمن کو تباہ اور برباد کرنے کے نعرے لگا رہے ہیں۔

دھرتی روتی ہے

بکری کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہی معصوم اور پیارے میمنے نے جو میمیانے کی پہلی آواز نکالی۔ اُس پر بستی کے رہنے والوں میں ایک عجیب بحث چھڑ پڑی۔ کچھ عقلمند جانور کہنے لگے کہ یہ معصوم دُنیا کی بے ثباتی پر رو دیا ہے کچھ نے میمنے کے میمیانے کو فطری عمل قرار دیا۔ بھیڑیئے جو گنتی میں تو بہت کم تھے لیکن اپنی مکارانہ چالوں کی وجہ سے جنہوں نے بستی میں دہشت پھیلا رکھی تھی کہنے لگے۔

"اِس میمنے نے گالی دی ہے۔ یہ بدیشی نسل کا میمنا ہے۔ اِن کی ساری نسل غدار ہے یہ کھاتے ہمارا ہیں اور گُن دوسری بستی والوں کے گاتے ہیں۔ اِن کے من کالے ہیں۔ یہ اپنی الگ حیثیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ قومی دھارے میں ختم ہونا نہیں چاہتے۔ یہ ہمیں اور ہماری بستی کو تباہ کرنے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ اِسی لئے تو یہ ہماری پراچین سبھیتا کو نہیں اپناتے۔ انہوں نے ودیشی تہذیب کو گلے لگا رکھا ہے۔ اُن کی شدھی کرنا لازمی ہے۔ اور آپ نے دیکھ ہی لیا کہ پیدا ہوتے ہی اِس میمنے نے گالیاں بکنا شروع کر دی ہیں۔" بستی میں رہنے والے سمجھ بوجھ کے مالک دوسرے بکروں میں سے ایک بولا

"بھائیو! ان پر کیوں شک کرتے ہو۔ ان کے ساتھ نفرت اچھی نہیں۔ یہ بھی تو ہماری طرح ہیں۔ ہماری اپنی نسل سے ہیں۔ ہمارا اپنا خون ہیں۔ صدیوں سے ہمارے ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارا دکھ سکھ سانجھا ہے۔ ہم نے مل کر ایک نئی تہذیب کو جنم دیا ہے۔ ہماری زبان ایک ہے۔ کلچر ایک ہے۔ اِس بستی میں رہنے والے ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ تم کیوں ان کی بربادی چاہتے ہو۔"

ایک بھیڑیا غصے سے آنکھوں سے گھورتے ہوئے اُس بکرے سے پوچھنے لگا۔

"بستی کی تقسیم کس نے کرائی۔"

"ہم سب نے مل کے۔ ہماری تنگ نظری اور ان کے کٹرپن نے۔ ہمارے چودھریوں کو راج سنگھاسن چاہئے تھا۔ اُس وقت سب لالچی بنے ہوئے تھے۔ اس میں ہم سب برابر کے قصوروار ہیں۔ صرف ان کو ہی اپرادھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہماری تنگ نظری اور غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری اپنی ہی نسل کے وہ کمزور مویشی جن کو ہم نے صدیوں سے غلام بنا رکھا ہے اب ہمارے ظلم و ستم سے تنگ آکر ہمیں چھوڑ رہے ہیں۔ ہم سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اِس لئے سب کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھو بھائیو۔ سب کو اپنا سمجھو۔ تبھی یہ بستی طاقتور اور خوشحال بن سکتی ہے۔"

"اِس بکرے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اِسے نکال دو یہاں سے۔ یہ اُن بکروں کا ایجنٹ ہے۔ کئی بھیڑیئے گرجنے لگے۔"

—— میں یہ سب سنتی رہتی ہوں۔ مجھے اِن بھیڑیوں کی نا سمجھی پر رونا آتا ہے۔ پر میں رونے کی بجائے ہنستی ہوں۔ کھِل کھِلا کے۔ میرے قہقہے جب بستی میں گونجتے ہیں تو بھیڑیوں کے دِلوں میں تیر چبھنے لگتے ہیں۔ وہ مجھے گھورنے لگتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرا گلہ گھونٹ دیں گے۔ کئی بار انہوں نے میرا گلہ دبایا بھی ہے۔ میرے سہاگ کے سبھی کپڑے اُتار کے میرے شریر کو ننگا کیا ہے۔ میرے پھول سے جسم پر انہوں نے اپنے قلم کی گندی سیاہی تھوپی ہے۔ میری خوبصورتی کو مٹانے کے لئے ...... کئی بار ان بھیڑیوں نے میری عزت لوٹی ہے۔ میرے وجود کی دلکش عمارت

کو کھنڈر بنانے میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اِن کو جب بھی موقع ملتا ہے، یہ میری عزت سے کھیلتے رہتے ہیں ــــ اور آج بھی میں اِن بھیڑیوں کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا دیکھ رہی ہوں ــــ میں سہم گئی ہوں۔ چپ چاپ بستی کے ایک کونے میں بیٹھی خیالوں کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی ہوں۔ اُس سمندر میں۔۔۔ جہاں میں نے حادثوں کے کئی تھپیڑے کھائے ہیں۔ کئی طوفان دیکھے ہیں ــــ میں نے کبھی بستی کو دُلہن کی طرح سجا ہوا دیکھا ہے۔ اور کبھی بیوہ کے سہاگ کی طرح اُجڑا۔ یہاں کئی درندے آئے۔ جنہوں نے میرے گہنے لوٹے۔ مجھے ننگا کیا۔ مجھ سے بلات کار کیا۔ مجھے جی بھر کے لوٹا۔ اور کئی سنت، پیر فقیر، درویش بھی آئے۔ جنہوں نے اپنے نور کی چادر سے میرے ننگے شریر کو ڈھانپا۔ انسانیت کی عظمت کے چراغ جلائے۔

میرا نام گنگا جمنا ہے۔ جانے میرے ماں باپ نے میرے نام کے ساتھ دیوی لفظ کیوں نہیں لگایا۔ شاید ان دنوں اِس پوِتّر شبد کو استعمال ہی نہیں لایا جاتا تھا ــــ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں لیکن میری عمر شاید ہزاروں سال سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے اس بستی پر موہنجوداڑو کی تہذیب دیکھی ہے۔ میں نے دراوڑوں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ میں نے آریوں کا اس بستی میں سواگت کیا ہے جو اپنے ساتھ علم و حکمت کے خزانے لائے تھے اور جو آج بھی اس بستی کی بنجر زمین میں دفن ہیں۔ میں نے عربوں کی دلیری، پٹھانوں اور مغلوں کی شجاعت دیکھی ہے۔ میں نے یہاں کئی قوموں کو اُبھرتے اور ڈوبتے دیکھا ہے۔ میں نے اشوک کا زمانہ دیکھا ہے۔ موریہ عہد اور اکبر کا راج دیکھا ہے۔ میں نے رام اور سیتا کے چرن چھوئے ہیں۔ مجھے کرشن کی مُرلی نے مست بنایا ہے۔ میں نے گوتم، نانک اور چشتی کو دیکھا ہے۔

ــــ میں یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں۔ انسانیت کا خاتمہ دیکھ رہی ہوں، حیوانیت کا عروج دیکھ رہی ہوں۔ میں جھگڑے ہی جھگڑے دیکھ رہی ہوں، دھرم کے نام پر نسل کے نام پر۔ علاقے اور زبان کے نام پر ــــ اونچ اور نیچ کے نام پر باغ کو اجڑتے دیکھ رہی

ہوں۔ ہر سُو پھیلے دھوئیں کو دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اب اِن میں آنسو نہیں ہیں۔ میں اب پگلی کی طرح بات بات پر ہنس پڑتی ہوں۔ میری بے بسی نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ ہاں! میں پاگل ہوں۔ اور پاگل پن میں ہنس رہی ہوں ..... بھیڑیوں کے فیصلے پر۔ وہ کہہ رہے ہیں۔

"یہ بدنیتی نسل کے میمنے ماں کی کوکھ سے ہی غداری کا سبق پڑھ کے نکلتے ہیں۔ لہٰذا اِس میمنے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اور اگر کوئی ہمارے فیصلے کے خلاف آواز اٹھائے تو اُس کو بھی ختم کر دو۔ ان کا خون بہا دو۔" ہاں اِن کا خون بہا دو۔ کیونکہ اِن کا لہو ...... لہو نہیں ہوتا —— پانی ہوتا ہے۔

بجھا چراغ

یا اللہ! میں نے کون سے گناہ کئے ہیں کہ اِن پہاڑوں کی خاک چھاننی پڑ رہی ہے۔ راستہ ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ ہم ٹھہرے شہری بابو! اگر آدھا کلو میٹر کا سفر بھی کرنا ہو تو سکوٹر، رکشا یا ٹیکسی کے بغیر قدم بھی نہیں اُٹھاتے، پر اب تک چالیس کلو میٹر سے بھی زیادہ پہاڑی راستہ پیدل کر چکا ہوں، لیکن وہ گاؤں ابھی تک نہیں آیا، جہاں میری الیکشن ڈیوٹی لگی ہے۔ چیڑ، دیودار، پھلائی، سنبل کمبلا، ورٹاہلی سے بھرے جنگلوں میں پگڈنڈی بل کھاتے ناگ کی طرح ڈس رہی ہے۔ انہیں پلاسو اور شہر گڈھی ندیاں اپنے عاشق چناب سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ دور سامنے ... کوثر ناگ کا نیلا پانی سورج کو نہلا رہا ہے۔ ریپر پنجال نے اپنے جسم پر برف کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ سردی اتنی شدید ہے کہ کانگڑی جم جائے۔ مگر سہارٹھ دیول اور لڈ کی پگڈنڈیوں نے میرا خون جمنے نہیں دیا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہے۔ اور میں چل رہا ہوں۔

مجھے گھر سے نکلے آج سات دِن ہوئے ہیں۔ مجھے اسمبلی کے حلقہ گلاب گڈھ کے پولنگ

سٹیشن نمبر 82 کا پریزائیڈنگ آفیسر لگایا گیا ہے۔ اڈنا مس میں ریٹرننگ افسر کی طرف سے ضروری احکامات اور الیکشن کا سامان لینے کے بعد میں اپنے پولنگ سٹیشن شہروں کی طرف چل پڑا ہوں۔ مہور سے میرے ساتھ گاؤں کا چوکیدار اور دو پولنگ افسر بھی آملے۔ یہ دونوں سکول ماسٹر ہیں۔ اِسی علاقہ کے رہنے والے۔ میرے پوچھنے پر وہ اپنے علاقہ کے بارے میں بتانے لگے۔

"بابوجی! بھوک اور بیماری ہمارے لوگوں کو ورثہ میں ملی ہے۔ زمین کی فصل پٹواری سے لے کر تحصیلدار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ پہلے جاگیرداری نظام چلتا تھا اب یہاں تحصیلداری نظام چلتا ہے۔ اِکادُکا کہیں کوئی ڈسپنسری بھی ملتی ہے لیکن دوائیوں کے بغیر۔ نیم حکیم کمپونڈروں کو یہاں ڈاکٹر کہتے ہیں جو اوّل تو ڈسپنسریوں میں ہوتے ہی نہیں اور اگر خدانا خواستہ کبھی ڈیوٹی پر حاضر بھی ہوں تو بیمار کو دیکھنے یا دوائی دینے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی دیسی گھی، کمبل یا مرغا ان نام نہاد ڈاکٹروں کو پیش کرے تو اُس بیمار کو ایک ایسا ٹیکہ لگاتے ہیں کہ سارے دُکھ دور ہو جائیں۔ بیماری کا نام نشان نہ رہے۔ دیکھئے بابوجی! ہمارے یہ مکان۔"

وہ راستے میں بنے کچے مکان مجھے دکھانے لگا۔

"ایک ہی کمرے میں گھر کے سارے افراد بھی رہتے ہیں اور مال مویشی بھی۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہماری تقریباً ساری آبادی اَن پڑھ ہے۔ بابوجی! ہمیں آزاد ہوئے ۲۵ سال ہو گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں جمہوریت ہے۔ ہر پانچ سال کے بعد یہاں چناؤ ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے نمائندے حکومت کرتے ہیں..... پھر یہ بھوک بیماری اور بے روزگاری کو دور کیوں نہیں کرتے۔ اِن کے کھوکھلے نعرے سادہ لوح بندوں کو ورغلانے کے لئے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ کب مِٹے گی غریبی؟ ہم تو غریب کو ہی مٹتے دیکھ رہے ہیں۔ بابوجی! دوسرے ملکوں کے لوگوں کو اُن کا حق دِلانے کے لئے زوردار آوازیں بلند کرنے والے اپنے لوگوں کو..... کب اُن کے حقوق بخشیں گے۔

— ہمارے ووٹ .... اور ہماری سادگی کے ٹھیکیدار ..."چڑھتا سورج" "ہاتھ" "سائیکل" "ہلدھر کسان" "چرخہ" — "چڑھتا سورج .... ترقی کی نشانی، ووٹ کا حقدار .... چڑھتا سورج۔ آپ کے سارے مسئلے حل ہوں گے" گائے اور بچھڑا ..... غریبی مٹانے اور دیش کو بچانے کے لئے اپنا قیمتی ووٹ گائے اور بچھڑے کو دیں" "تانا شاہی مٹانی ہے، ہلدھر پر مہر لگانی ہے" یہ تقریریں سُن سُن کر تو ہمارے کان پک گئے ہیں لیکن ہمیں عزت کا مقام ملا ہے نہ ہماری غریبی دور ہوتی ہے"

"پر یہ کیونکر دور ہو گی ماسٹر جی؟" میں نے پوچھا۔

"بابو جی! ہمیں امیر غریب کا فرق مٹانے کے لئے کچھ کرنا ہو گا۔ کوئی ٹھوس تبدیلی لانا ہو گی۔ میرا مطلب ہے ......" دوسرے ماسٹر نے اُس کی بات کاٹ دی اور بولا۔

"بابو جی! ہمیں سارا نظام بدلنا ہو گا۔ ہمیں ایک نیا انقلاب لانا ہو گا۔"

"پر انقلاب کے نعرے تو پہلے بھی گونجتے تھے۔ سماج واد کا راستہ تو پہلے بھی دکھایا جاتا تھا مگر کیا انقلاب آیا؟" "ہے انقلاب ..... بابو جی! جبھی آئے گا، جب عوام ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں گے۔ جب انسانی ضمیر جاگے گا — ہمیں عوام کو تیار کرنا ہو گا — اِس نظام کے خلاف .... جس نے زندگی کو سخت پریشان بنا دیا ہے۔ ہمیں لوگوں کو اچھے اور بُرے کی تمیز سکھانا ہو گی۔ آج سارے دیش میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ سکے کا پھیلاؤ، روپیہ کی قیمت نہ ہونے کے برابر، مہنگائی، آئے دن قیمتوں میں اضافہ، کمر توڑ ٹیکس، اشیائے ضروریہ کا کال۔ یہ سب کچھ اِس گندے نظام کی دین ہے۔ یہ سب بدلنا ہو گا۔ ہمارا سیاسی نظام سودے بازی کی دین ہے۔ سودے بازی .... سرمایہ دار اور جمہوریت کا ڈھول پیٹنے والوں کے درمیان۔ سود لطے ہوتا ہے .... غریب کا خون نچوڑنے کا۔ بابو جی! یہ سرمایہ دار جمہوریت کے اَن داتا ہیں۔ یہ عوام

کُنندہ دیکھنے والے دیتے ہیں۔ یہ چناؤ کے خریدار ہیں۔ یہ پیسہ دیتے ہیں.... سو گنا سود پر.... اور ایسے چندہ کا نام دیا جاتا ہے — کچھ نوکریاں، کچھ سکول، کچھ ڈسپنسریاں، کچھ سڑکیں اور..... کچھ اور وعدے — اس طرح الیکشن ختم اور جمہوریت زندہ باد۔"

یہی باتیں کرتے کرتے ہم اپنے پولنگ سٹیشن پہنچ گئے — آج پولنگ کا دن ہے۔ لوگ ووٹ ڈالنے آرہے ہیں۔

"بیٹا! ہم کہاں مہر لگائیں۔"

"جہاں تمہاری مرضی بابا۔"

"ہمیں کیا پتہ۔ تم جہاں چاہو بابو، خود لگالو۔"

"او بھائی، مہر ووٹ والے کاغذ کی پچھلی طرف نہیں لگاتے۔ یہ سامنے جو چار نشان دکھائی دے رہے ہیں نا، اِن میں سے اُس نشان پر مہر لگادو، جہاں تمہاری مرضی ہو۔"

"ہماری کیا مرضی صاحب! جہاں جناب فرمائیں گے، وہاں لگادوں گا۔"

"مجھ کو سرپنچ نے کہا ہے کہ مہر گائے اور بچھڑے پر لگادو۔ کہاں ہے بابو، گائے اور بچھڑا۔ مجھے دکھانا، ذرا جلدی۔ گھر میں بھینس بھوکی ہے۔"

دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں چناؤ ہو رہے ہیں۔ لوگ ووٹ ڈال رہے ہیں۔ اپنا قیمتی ووٹ۔ آزادی، لوک راج، خوشحالی کی نشانی......"

"بابو جی! ہمیں ایک نیا انقلاب لانا ہوگا۔"...... "ہم کو یہ نظام بدلنا ہوگا...."! اور میں کرسی پر بیٹھا اپنی ڈیوٹی دے رہا ہوں۔

آئینہ جھوٹ بولتا ہے

رشوت کو روکنے کے لیے ہر چناؤ کے بعد نئی کوششیں کی جاتی ہیں — اب کی بار پردیش کے سارے سرکاری ملازمین کو ایک جگہ پہ جمع کیا گیا — ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، بودھوں اور عیسائیوں کو اُن کے عقیدے کے مطابق حلف دلایا گیا کہ وہ آئندہ رشوت نہیں لیں گے اور ایمانداری کے ساتھ اپنے سرکاری فرائض انجام دیں گے۔

حلف اُٹھانے کے کچھ ہی روز بعد مرزا اشرافت علی نے شری سوم ناتھ شاستری کی جگہ کنچن پور کے منصوبہ بندی افسر کا عہدہ سنبھالا۔ اُنہوں نے سارے علاقہ کا طوفانی دورہ کیا۔ لوگوں کی شکائتیں سُنیں۔ وہاں ہوئے ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیا..... مگر اس پہاڑی علاقے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کئے گئے سبھی کام..... اللہ دین کے طلسمی چراغ کی طرح غائب تھے..... اور دفتر کی فائلیں پکار پکار کر..... کُھل جا سم سم کہہ رہی تھیں۔

مرزا اشرافت علی — علی بابا کی طرح دھڑا دھڑ چالیس چوروں کے کارنامے پڑھنے لگے۔

"پرائمری سکول کی پختہ عمارت کے لئے...... تیس ہزار روپے"

"پینے کے لئے پانی کا کنواں کھودنے پر...... سات ہزار روپے"

"پنچایت گھر بنانے کے لئے .... دس ہزار روپے"

"ندی پر لکڑی کا چھوٹا پل بنانے کے لئے...... پانچ ہزار روپے"

"کام پورے ہو چکے ہیں اور رقم ادا کی جا چکی ہے"

مرزا جی کاغذی ہیرا پھیریاں دیکھ کر مسکرائے...... اور سوچنے لگے ــــ رشوت اور غبن سرکار کی طرف سے سنگین جرم قرار دیئے گئے ہیں جن کی سزا دس سال تک ہو سکتی ہے اور جرمانہ الگ ــــ اگر وہ سوم ناتھ شاستری کے خلاف کیس بنا کر اوپر بھیج دیں تو......؟...... نہیں نہیں! بیچارہ غریب افسر مارا جائے گا۔ مرزا شرافت علی ہنس پڑے اور پھر...... انہوں نے اپنے کلرک کو بلایا اور اس پسماندہ پہاڑی علاقہ کی ترقی کے لئے بڑی شرافت اور ایمانداری سے ایک نیا منصوبہ تیار کروایا ــــ اور اپنے بڑے دفتر کو منظوری کے لئے بھیج دیا۔

"پینے کے لئے پانی کا کنواں کھودنے اور اسے پختہ بنانے پر...... پندرہ ہزار روپے"

نوٹ:۔ پہلے کھودے گئے کنوئیں کے پانی میں زہریلا مادہ پایا گیا تھا اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اُس کنوئیں کے پانی سے لوگوں میں انتڑیوں کی بیماری پھیلنے کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ لہذا کنواں مٹی سے بھر دیا گیا۔ ڈاکٹری رپورٹ کی نقل شامل کی جا رہی ہے۔

"پنچایت گھر اور سکول بلڈنگ کی مرمت کے لئے...... دس ہزار روپے"

نوٹ:۔ دونوں عمارتوں کی چھتیں قیامت خیز برسات کی وجہ سے ڈھ گئی ہیں۔ اور دیواروں کے گرنے کا بھی سخت خطرہ ہے۔

ندی پر آمد و رفت کے لئے ایک پختہ پل بنانے کے لئے...... پچاسی ہزار روپے

نوٹ:۔ لکڑی کا وہ چھوٹا پل جو پچھلے سال ندی پر بنایا گیا تھا،.........

......تھا برسات کے کارن ندی میں آئی طوفانی باڑھ میں بہہ گیا ہے۔ مقامی لوگوں
کو ندی کے آر پار آنے جانے میں بڑی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ عوام کا زوردار مطالبہ
ہے کہ اب کے ندی پر پختہ پل بنایا جائے۔"

ــــــ متعلقہ محکمہ کے بڑے افسروں نے ضروری جانچ پڑتال کرنے کے بعد
نئے منصوبہ کی منظوری بھی دے دی۔ ......

اُجالے کی تاریکی

"آج کی دنیا میں ایمانداری سب سے بڑا جرم ہے" پریتم سنگھ سوچنے لگا۔ اُسے آج اپنی ایمانداری کا صلہ ملا تھا۔ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ۔ سچائی اور فرض شناسی کا انعام — ملازمت سے اُس کی برطرفی کا آرڈر۔ اُس نے حکم نامہ پڑھا اور مسکرا دیا۔ اُس کے چہرے پر مایوسی یا پریشانی کی کوئی نشانی نہ تھی۔ اُس نے کاغذ کے اِس پُرزے کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور اپنے قدم گھر کی جانب بڑھا دیئے۔

اُس نے اپنا کمرہ کھولا۔ ایک نظر اُس کا جائزہ لیا۔ کمرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ اِس خزاں آلود زندگی کا ساتھی اب یہی کمرہ ہی تو ہے۔ ویسے اب اِس ویران کمرے میں رکھا ہی کیا تھا۔ چند سہانے خواب... چند دِل خراش تعبیریں — وہ سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی گورو نانک جی کی تصویر دیکھنے لگا۔ جن کی آنکھوں سے نور برس رہا تھا۔ سچائی کا نور، حق و صداقت کا نور، جن کی پوتر بانی کا پاٹھ کرتے ہوئے اُس نے سچائی اور ایمانداری کی ڈگر اپنائی تھی۔ یہ ساتھ والی تصویر اُس کی ماں کی ہے۔ ایک آدرش ماں کی۔ جس کی تعلیم و تربیت

کی قیمت آج اُس کے جیب میں تھی۔ اُس کی نظر دوسری دیوار پر لٹکے فریم پر پڑی جس میں سے کلونت سنگھ مسکرا رہا تھا۔ ہاں! کلونت سنگھ۔ اُس کا دوست۔ اُس کی نظریں میز پر پڑی اُس عورت کی تصویر پر ٹھہر گئیں جو اُس کی اپنی تصویر کے پہلو میں تھی ـــــ امرجیت کور ـــــ اُس کی بیوی۔

اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اُس کی پُرسکون آنکھیں اپنی حیات کی کتاب پڑھنے لگیں۔ اوراق پلٹنے لگے۔

ـــــ پریتم سنگھ ایک معصوم لڑکا اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہے۔ ماں اُسے سکھا رہی ہے۔ "بیٹا! ایمانداری ایک حسین زیور ہے۔ نیک اور سچا انسان دُنیا میں ہمیشہ سرخرو رہتا ہے۔ کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ جھوٹے انسان دُنیا میں ذلیل رہتے ہیں۔ غریبوں اور مظلوموں کی سیوا کرنے والے پرماتما کے گھر ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ تم بھی ایمانداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"

ـــــ پریتم سنگھ نے بی۔ اے کر لیا ہے۔ وہ اب جوان ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو تکتا ہے۔ ہنسی خوشی دن گزر رہے ہیں...... لیکن یہ کیا ہو گیا۔ انسانیت پیروں تلے کچلی جا رہی ہے۔ خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ مظفر آباد کی حسین بل کھاتی ندیوں کا شفاف پانی انسانی خون سے رنگا جا رہا ہے۔ ہم سکھ ہیں۔ تو کیا ہوا؟ انسان ہی تو ہیں۔ اُسی خدا کی مخلوق ہیں جس نے اِن درندوں کو بھی بنایا۔ کیا یہی اِن کا مذہب سکھاتا ہے...... نہیں۔ نہیں.... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مذاہب تو انسانیت کے رکھوالے ہیں پھر یہ کُشت و خون کیوں؟

ـــــ طوفان تھم چکا ہے ـــــ پریتم سنگھ سرینگر کے مہاجر کیمپ میں ہے۔ آج والدین کا کوئی پتہ نہیں۔ دُنیا میں اب اُس کا کوئی بھی نہیں ـــــ مہاجروں کو کیمپ میں ہر طرح سے تحفظ دیا گیا ہے ـــــ پھر سے بسانے کی سہولیات دی جا رہی ہیں۔ روزگار دیا جا رہا ہے۔

ـــــ پریتم سنگھ بھی محکمہ جنگلات کے رینج افسر کی ٹریننگ کے لئے جا چکا ہے۔

ـــــ دو سال کی تربیت کے بعد آج اُس کا تقرر پنجال رینج میں ہوا ہے ـــــ

وہ رینج کے ہر کمپارٹمینٹ کا معائنہ کر رہا ہے۔ قومی سرمایہ کی بربادی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اکثر درختوں کی کٹائی بلا اجازت ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے عملے کو حق گوئی اور نیک چلنی کا درس دیا۔ لیکن اُس کی باتیں کسی کو سننا کب گوارا تھیں۔ اُس کا عملہ و افسران سبھی اُس سے نالاں ہونے گئے۔

—— پریتم سنگھ کی شادی ہو چکی ہے۔ امرجیت کور سے ..... امرجیت .... کانٹوں سے سجا ہوا ایک پھول۔ جس نے آتے ہی اُس کی سکون پرور زندگی میں کانٹے بچھانے شروع کر دیئے —— امرجیت کور —— فیشن پرست، بناؤ سنگار کی دائمی مریض۔ لُوس کی رسیا۔ پریتم سنگھ کی ساری تنخواہ فضول خرچی کی نذر ہونے لگی۔ وہ تنگ دست ہوتا گیا۔ اسے کئی بار خیال آیا۔

"ہوں! میں بھی رشوت لوں۔ کیا ساری پارسائی میرے لئے ہی ہے؟..... نہیں نہیں..... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میری ماں نے مجھے ہمیشہ راستی کی تعلیم دی۔ میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ امرجیت کو سمجھاتا۔

"انسانی زندگی کے لئے روٹی اور کپڑا بنیادی ضرورت ہے۔ وہ ہمیں میسر ہے۔ اور ہمیں کیا چاہیئے۔ تم یہ فضول خرچی چھوڑ دو۔ پیسے کی بچت کرو۔ کچھ آگے کا بھی سوچو۔"

"کیا میں نے آگے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ یہی دن تو ہیں کھانے لگانے کے۔ تمہیں میری ہر بات بُری لگتی ہے۔ میں اگر اتنی ہی بُری تھی تو شادی کیوں کی مجھ سے۔ دیکھو جی! میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم میرے معاملے میں دخل دو.... سمجھے۔"

میاں بیوی کے درمیان نفرت کی خلیج وسیع ہونے لگی۔ اکثر جھگڑے ہوتے۔

"ایمانداری۔ ایمانداری۔ ایمانداری —— میں پوچھتی ہوں کیا دُنیا میں ایمانداری کا

ٹھیکہ ایک تمہی نے لے رکھا ہے۔ وہ دیکھو ہربھجن سنگھ جو کل فارسٹر تھا آج ایک بنگلے کا مالک ہے۔ تمہارا دوست اصغر جو تمہارے ساتھ ہی لگا تھا۔ اُس کے دو مکان یرزلہ میں ہیں ایک سیبوں کا باغ ہے۔ کار رکھی ہے۔ بیوی گہنوں سے لدی ہے۔ تم سے تو وہ گلا ہی اچھا ہے جو ایک معمولی گارڈ ہوتے ہوئے بھی ایک حویلی اور دو ٹھیکیوں کا مالک ہے۔ اور ایک تم ہو۔ ابھی تک اپنے دو کمرے بھی نہ بنوا پائے۔ آخر کیا دیا تمہاری اِس ایمانداری نے۔ اُلٹا مجھی کو کوستے رہتے ہو۔ دیکھو جی! یہ یُگ 'ستیہ یُگ' نہیں ہے۔ بیسوی صدی ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلو۔ جو سبھی کر رہے ہیں تم بھی کرو۔

”یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرو۔ میں رشوت ہرگز نہیں لے سکتا۔“

—— پریتم سنگھ کو کٹھوعہ رینج میں تبدیل کیا گیا ہے۔ یہاں کا ڈویژنل فارسٹ افسر کلونت سنگھ ہے۔ مظفر آباد کا رہنے والا۔ اُس کا کلاس فیلو۔ دونوں ملے۔ دوستی بڑھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا شروع ہوا —— کلونت سنگھ ضرورت سے زیادہ پریتم کے گھر آنے جانے لگا ہے۔ اکثر امرجیت کلونت سنگھ کے ساتھ فلمیں دیکھتی ہے۔ امرجیت اب کافی خوش ہے —— پریتم رینج کے جس کمپارٹمنٹ میں بھی گیا وہاں اُسے گول مال ہی دکھائی دیا۔ وہ قومی آمدنی کے لٹنے پر تلملا اٹھا۔ اُس نے ایک مفصل رپورٹ چیف کنزرویٹر کو لکھ بھیجی ہے۔

—— امرجیت اور کلونت —— بدبو پھیلتی جا رہی ہے —— پریتم نے اپنی آنکھوں پہ بھروسہ کر لیا ہے۔

”کلونت! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ تم اتنے کمینے نکلو گے۔ میری ہی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ کیا یہی دوستی ہے۔ اِسی کا دم بھرتے تھے۔“

"نہیں کچھ نہ کہو۔ میں خود تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔"

—— پریتم سنگھ اکیلا ہے —— اس کی بھیجی ہوئی رپورٹ خود اس کے لئے زہر ثابت ہو رہی ہے۔ تمام کاغذی ثبوت غائب ہیں۔ تمام شہادتیں اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ اس کی کوئی نہیں سنتا۔ کلونت اسے پھانسنے میں پیش پیش ہے —— پریتم کی تنخواہ بند ہو چکی ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ وہ کئی دن سے بھوکا ہے۔ لیکن کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے یہ اس کی غیرت گوارہ نہیں کر سکتی۔

—— وہ ایمانداری کا پھل کھا رہا ہے۔ وہ پہروں گورو نانک کی تصویر کو گھورتا رہتا اور سوچتا۔

"کیا ایمانداری کا انجام یہی ہوتا ہے؟"

—— آج اس کے کیس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ اسے قومی سرمائے کو خورد برد کرنے، رشوت لینے اور سرکاری کام میں کوتاہی برتنے کے الزام میں نوکری سے ڈسمس کر دیا گیا ہے ——

—— کتاب بند ہو چکی ہے۔

پریتم سنگھ اپنی چارپائی سے اٹھا۔ وہ کمرے کی اداسی کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے سجانے لگا۔ اس نے گورو نانک کی تصویر کو صاف کیا۔ اپنی ماں کی فوٹو سے دھول جھاڑی۔ وہ کلونت سنگھ کی تصویر کے قریب پہنچ کر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب طرح کی سنجیدگی تھی۔ پھر اس کی نگاہیں امرجیت کی تصویر پر جا اٹکیں۔ اس نے بڑھ کر میز سے تصویر اٹھائی اور کلونت کی تصویر کے بالکل ساتھ لٹکا دی۔ پہلو بہ پہلو۔ پھر دونوں تصویریں صاف کر کے وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا آیا۔ دور کسی گرد و غبار میں گم ہونے کے لئے ....

سیاست

یووالوک پرچار سمتی کی طرف سے دیش بچاؤ ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ نئی نسل کے مایوس اور زندگی سے ٹوٹے ہوئے نوجوان روز تقریریں کرتے۔ "ملک خدا کا قبضہ دیرے گیرے نتھو خیروں کا۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس دیش میں چور اچکے چوہدری بن بیٹھے ہیں۔ یہاں سچ کی فصل اگانا اور محنت کی کمائی کھانا حرام ہے۔ یہاں گن تنتر، پرجا تنتر اور سوتنتر سب دل بہلانے کے منتر ہیں۔ یہاں پرجاتنتری مریادا ڈھینگ ہوتی رہے گی۔ کیونکہ عوام آزادی کی بھنگ پی کر سوئے ہوئے ہیں۔ اس آزادی کے نشے میں مست ہیں، جس کی دین ..... بیروزگاری، فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، بدامنی، رشوت، تسکری، بے ایمانی اور مہنگائی ہے......"

—— دیش بچاؤ ہفتے کے کارن سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں حاضری معمولی تھی۔ مگر شریف اور اعلیٰ گھرانوں کے ودیارتھی ..... اپنی اپنی کلاسوں میں جاتے تھے۔ اور انہیں اس طرح کے ڈھونگ رچانے والوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت

پڑھائی میں لگانا چاہتے تھے .... تاکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اچھی اچھی نوکریاں حاصل کی جا سکیں۔ بیوپار اور سیاسی کاروبار میں سرگرمی سے شامل ہو کر دیش کی بہتر طور پر سیوا کی جا سکے۔ کلاسوں میں جانے والے طلبا میں مشہور جنتا سیوک "اودھ کسان شوگر ملز" کے مالک گنڈامل شاستری کا اکلوتا بیٹا لکھشمن بھی تھا جو کبھی کبھی کالج چوک کے پاس دھرنا دیتے ہوئے اپنے ساتھی طلبا کا تماشہ دیکھنے کے لئے کچھ پل کھڑا ہو جاتا۔ وہ کبھی کبھی وہ یار بھی۔ لیڈر رام کو تقریر کرتے ہوئے بھی دیکھتا۔

"دوستو! یہاں آزادی کے مجاہدوں، اُن کے بہن بھائیوں، بیٹے، بیٹیوں، دامادوں اور دیگر رشتہ داروں نے .... آزادی دلانے کی قیمت پوری طرح وصول کر لی ہے۔ اِن سوتنتر سیلانیوں کے کالے کارناموں کی پستک جنتا نے پڑھ لی ہے۔ اب یہ قوم دشمن لیڈر زیادہ دیر تک اپنے گناہوں کی گٹھڑی لئے نہیں گھوم سکتے۔ اب اِن مجاہدوں اور قومی رہنماؤں کے سیاسی اور سماجی بینکوں میں لوگوں کو بیوقوف بنانے والے نعروں کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے اور بینک دیوالیے ہو گئے ہیں ——"

رام اور لکھشمن دو گہرے دوست ہیں لیکن خیالات نہیں ملتے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود بھی اِن کی دوستی مثالی تھی۔ لکھشمن، رام کو سمجھاتا کہ وہ یہ کھیل چھوڑ دے۔ جذباتی تقریروں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دے، کیونکہ روشن دل و دماغ سے ہی صحت مند سوتنترتا مل سکتی ہے۔ تعلیم ہی سماج میں پھیلی ہوئی ہر بیماری کا علاج ہے —— لیکن رام اُس کی فضول سی نصیحتوں کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کہتا —— "دیکھنا لکھشمن! ہم یہ نظام بدل کر دم لیں گے"۔ پھر .... دھرنوں نے جلوسوں کی شکل اختیار کر لی۔ جلوس شہر کے بازاروں سے گزرنے لگے۔ اندولن پھیلنے لگا۔ جلوس وزیروں کی کوٹھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ مظاہرین کو پولیس روکنے لگی۔ ٹکراؤ ہونے لگا۔ تشدد بھڑکنے لگا .... اور آخر گولی بھی چل گئی۔ ایک طالب علم مر گیا اور کچھ طلبا زخمی ہو گئے۔ جنتا "دیش بچاؤ ہفتہ" کا نوٹس لینے لگی۔ جلوسوں میں گنتی بڑھنے لگی۔ تقاریر میں زیادہ گرمی آ گئی۔ لفظوں کے جادوگر رام کا ایک ایک لفظ لوگوں کے دلوں کو گرما رہا تھا۔

"بہنو اور بھائیو! یہ قومی لیڈر اور ان کے چیلے چانٹے سب خون چوسنے والی جونکیں ہیں۔ یہ لوگ عادی مجرم ہیں۔ اِن کی دیش سیوا کی بھاؤنا کے ارتھ لوٹ مچانا ہے۔ یہاں بھارتیہ کرن، اسلامی کلچر، ہندو راشٹر اور اسلامی پرچم کا مطلب فرقہ دارانہ فسادات کرانا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ابھی بھی دیش واسیوں کو مندر، مسجد، گرجے اور گوردوارے کی

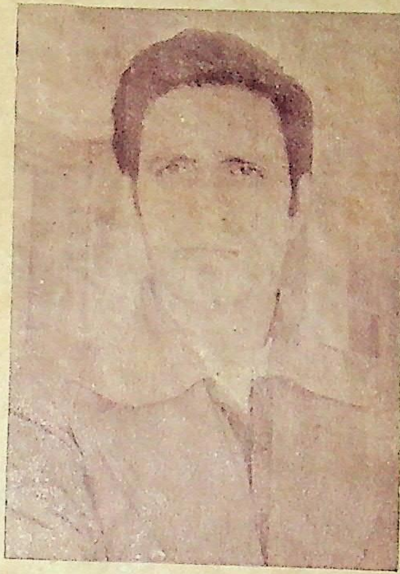
حدود سے باہر نہیں جھانکنے دیتے۔ فرقہ دارانہ فسادوں کے لئے یہاں..... مذہب ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔ یہ لیڈر اور قوم کے غمخوار راج سنگھاسن پر قبضہ کرنے اور اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے.... کروڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی طرح انسان خرید کر جلسے کراتے ہیں اور اپنی شہرت کا ڈھول پٹواتے ہیں۔ یہ گندی نسل کے کیڑے، دن بہ دن گندگی پھیلا رہے ہیں۔ اِن کے آدرشوں کے نمونے اُن کے بیٹے اور داماد ہیں۔ جنھوں نے اندھیر نگری مچائی ہوئی ہے۔ یہ بڑے بڑے سمگلر، چرس اور شراب کے بیوپاری، سٹے باز اور جواری، عورت کے گوشت کو نوچنے والی گدھیں، اُن کے ساتھ ننگی تصویریں کھچوانے والے عیاش، ملک کے راز دشمن کو بیچنے والے قوم پرست..... سب دیش کی عزت کے لُٹیرے ہیں ۔۔۔ بھائیو! خدا کا واسطہ ہے اِن کافروں کے قریب بھی نہ آؤ۔ اِن کے آدرشوں اور اصولوں کا سایہ بھی اپنے بچوں پر نہ پڑنے دو۔ ورنہ ہر گھر میں کافر پیدا ہوں گے اور کافر ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے، کیونکہ کافر وہ ہے جو بھگوان کو نہ مانے، خدا کو نہ مانے اور اپنی خدائی چلائے۔ جو انسانیت کا قتل کرے۔ سا تھیو! یہ کافر منگھشتا کا قتل کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی خدائی چلائی ہوئی ہے۔ اِن فرعونوں کی خدائی کو مٹا کر رکھ دو۔ اِن کا تختہ اُلٹ دو۔ اِن کی کوٹھیوں کو جلا ڈالو۔" انقلاب زندہ باد... انقلاب زندہ باد.... رام بابو زندہ باد....." عوامی سمندر میں طوفان آگیا۔ مزدور، دہقان، کھیت مزدور، بے روزگار، بے گھر اور بے زمین لوگ، بے اصولی اور عوام دشمن سرکار کو ختم کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ رام کی لگن، ہمت اور خیالات سے آخر لکھمشن بھی متاثر ہوا۔ اُس نے اپنا راستہ بدل لیا اور رام کو اپنا نیتا مان کر اندولن میں شامل ہو گیا... اور وہ بھی تقریریں کرنے لگا۔

"جو سرکار عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان نہیں دے سکتی۔ اُس کا اقتدار میں رہنا برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ دوستو! میں ایک سیٹھ کا بیٹا ہوں۔ اُس سیٹھ کا، جس نے جنتا کا لہو چوس کر لاکھوں روپے کمائے ہیں۔ جس کی ایک شوگر مِل ہے۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی حویلی ہے، جو مندر، مسجد اور دیگر سماجی بھلائی کے کاموں کے لئے اگر ایک ہزار چندہ دیتا ہے۔ تو سہ گنا وصول کرتا ہے، پھر بھی وہ جنتا کا سیوک کہلاتا ہے۔ اُس نے یہ سب میرے لئے بنایا ہے، لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں کیونکہ میرے دیش واسی بھوکے ننگے ہیں۔ میں دھرتی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ

میں بھی تب تک بھوکا ننگا ہی رہوں گا جب تک ملک کے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان نہیں مل جاتا۔ اس لئے بھائیو! آگے بڑھو ... اور مسمار کر دو عوام کی کمائی کی بنی ہوئی یہ حویلیاں۔ جلا دو یہ غریبوں کا خون چوسنے والی سرمایہ دار فیکٹریاں" ـــ جلوس، مظاہرے، نعرے ..... "عوام دشمن سرکار نہیں چلے گی۔ سرمایہ داری مردہ باد۔ نادر شاہی مردہ باد" ـــ دفتروں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہڑتال۔ پتھروں کی بارش، لاٹھی چارج، آنسو گیس، گولیاں، کئی انسانی جانوں کا نقصان۔ سینکڑوں زخمی۔ توڑ پھوڑ، آگ ہی آگ ـــ جوشیلا لکھشمن ..... بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ پولیس کی مدد کے لئے فوج بلائی گئی۔ سرکار نے اندولن کاریوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا یقین دلایا۔ ودیارتھی لیڈر رام کچھ شرطوں پر حکومت کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے ایک عوامی جلسہ بلایا۔ جلسے سے لکھشمن اور دوسرے ودیارتھی لیڈروں نے خطاب کیا اور حکومت کے ساتھ بات چیت کرنے کی سخت مخالفت کی ـــ پر شبدوں سے کھیلنے والے رام بابو نے اپنی تقریر میں عوام کو سمجھایا۔

"ہمیں بات چیت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے اصول اور اپنا ضمیر نہیں بیچیں گے۔ ہم بنیادی مانگوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ دوستو! ہم چاند نہیں مانگتے، ہم تو صرف وہ حقوق مانگتے ہیں جو دیش کے آئین نے ہمیں دیئے ہیں۔ اگر سرکار نے ہماری مانگیں تسلیم نہیں کیں تو ہم اپنی پُر امن تحریک جاری رکھیں گے۔" ـــ جنتا نے زور دار تالیاں بجائیں اور رام بابو کے حق میں نعرے لگائے ـــ بات چیت کے دوران اندولن روک دیا گیا۔ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے حکومت نے گرفتار کئے گئے طلباء، مزدوروں اور ملازموں کو رہا کر دیا ـــ گفتگو لمبی ہوتی گئی۔ ـــ ہر روز ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں میں خبریں آنے لگیں ـــ "بات چیت دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ دونوں دھڑے ایک دوسرے کے نظریے کو سمجھنے لگے ہیں۔

دو ریاد تھی نیتا رام بابو بات چیت سے پوری طرح مطمئین ـــ سرکار نے عوام کی جائیز مانگوں کی جانچ کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے ـــ حکومت نے مظاہروں میں مرنے والوں کے لواحقین کو دس دس ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تحریک میں جن لوگوں کی جائیداد کو نقصان پہونچا ہے سرکار کی طرف سے اُن کو معاوضہ دیا جائے گا۔" بات چیت کے نہ جانے کتنے دور ہوئے۔ اندولن کاریوں کے جذبات ٹھنڈے ہو گئے۔ تحریک مردہ ہو گئی..... اور ایک دن یہ خبر آئی کہ سرکار نے طلبا کو بھی حکومت میں نمائیندگی دینے کا فیصلہ کیا ہے ـــ پھر کچھ دنوں کے بعد رام بابو کو اپیر ہاؤس کا ممبر بنا کر وزیر بے محکمہ بنا دیا گیا ـــ نوجوان نسل "طلبا" مزدور اور ملازمین بہت خوش تھے لیکن ایکششمن..... جس نے گندی سرکار کو بدلنے کے لئے تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، جس نے رام بابو کو اپنا نیتا تسلیم کیا تھا، جس نے اپنے ماں باپ سے بغاوت کی تھی، جس نے اپنی تعلیم کا ایک قیمتی سال ضائع کر دیا تھا، ہاں! وہ ایکششمن..... ذہنی انتشار میں مبتلا..... بے چین ہواؤں میں گم ہو گیا۔ کسی نے اُس کے وجود کو تلاش نہیں کیا ـــ



Khalid Hussain